مطبوعات بیت الحکمت ۔ دہلی (ہند) (۳)

مشکلات قرآن کا انقلابی حل

پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں

محمد اجمل خاں

1952

قرآن کریم کا انقلابی طرزِ خطاب

ہر مفکر سوچنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نثر سے پہلے شعر وجود میں آیا ہے۔ شعر میں احساسات و جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فنکار خواہ وہ مصور ہو یا شاعر، مغنی ہو یا مہندس و بت تراش، اپنے لطیف جذبات کی تخلیق میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دوسرے بھی خود اس کی طرح متاثر ہوں۔ اس تخلیق میں نثر کی سی خشک منطق اور محض دماغ کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔ شعر میں دل حاکم ہوتا ہے اور دماغ محکوم، اور "معنی" یعنی احساس دل، روحانیت کے افق سے طلوع ہو کر الفاظ و استدلال دماغ کی "صورت" کو اپنے نور سے معمور کر دیتا ہے۔

یہ حسین تخلیق اگر نثر کی شکل میں جلوہ فرما ہو تو اسے خطابت کہتے ہیں۔ اس میں عقلی دلائل شاعرانہ معنویت کے ذریعے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں لیکن اگر نثر کو محض منطق و عقل کا لباس پہنا دیا جائے تو اس میں شعر و خطابت کی سی آفرینی نہیں رہتی۔

قرآنی طرزِ بیان میں نہ تو شاعری کی سی محض معنویت ہے، نہ نثر کی سی محض کرخت منطق۔ اس میں مخاطب کے افکار و ماحول کے مطابق وہ جادو بیانی ہے کہ دل و دماغ دونوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ یہی اس کے الہامی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس طرزِ بیان نے دنیائے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی نثر کو نظم اور نظم کو نثر کے پیرایہ میں لا کر دونوں میں جوشِ نمو و حیات بھر دیا۔ بہ الفاظ دیگر عقل و ہوش کی تیرگی کو محبت و شوق کی تابانی سے پُر نور کر دیا۔

لقد یسّرنا القرآن للذّکر فھل من مدّکر؟
(خدا نے قرآن کو نہایت ہی آسان طریقۂ علم و عمل بنایا ہے۔ کوئی ہے جو اس پر عمل کرے؟)

مشکلات قرآن

کا

انقلابی حل

محمد اجمل خاں

پہلا اُردو اڈیشن ۱۹۵۲ء (۱۳۷۲ھ)

مطبوعہ یُونین پرنٹنگ پریس، اُردو بازار جامع مسجد دہلی میں چھپی
اور
بیت الحکمت دہلی (ہند) کی طرف سے سیف الاسلام خاں جامی نے شائع کی

سول ایجنسی در ہند:- سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی (ہند)
سول ایجنسی در پاکستان:- مکتبہ بیت الحکمت۔ اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

قیمت فی جلد ایک روپیہ

فہرست عنوانات

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط وخال

از

محمد اجمل خاں

۱۔ پس منظر اسلام (چار حصے) ایک مجلد میں (ابتدائے عالم سے بعثت محمدی تک)

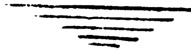
۲۔ ترتیب نزول قرآن کریم :۔ جس سے قرآن کریم کی تاریخی ترتیب معلوم ہو جاتی ہے۔ قیمت صہ ر

۳۔ مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم :۔ اس سیرت میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب سے پورے قرآن کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قرآن کریم اور سیرت نبوی کا کوئی گوشہ مبہم نہیں رہتا۔ اور اسلام کا روشن چہرہ بغیر کسی تاویل کے سامنے آجاتا ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ ر)

۵۔ مشکلات قرآن کا انقلابی حل :۔ عدم ترتیب قرآن کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کا حل خود قرآن سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت۔

۶۔ " اعلان انقلاب " یعنی مفہوم سورۃ العلق :۔ حقیقی فاتحۃ القرآن کا انقلابی پیغام " اعلان انقلاب " کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں عالمی فلسفۂ تخلیق و علم سے بحث کی گئی ہے اور بتا یا گیا ہے کہ قرآن حکیم کا یہ پہلا پیغام ہی اساس کتاب اللہ اور اسلام ہے۔ قیمت

۷۔ پیمان انقلاب ۔ یعنی مفہوم سورۃ الحمد :۔ کو ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اور امام ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ کے علاوہ ہندوستان کے مترجمین کے چوبیس ہندی اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ اس رسالے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ترتیب تنزیلی کو پیش نظر رکھا جائے تو اسلام کا انقلابی پیغام نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔



تمہید

بسمہ سبحانہ
"لیس للانسان الا ما سعی"
(جو بوؤ گے وہ کاٹو گے)

انقلاب کی ابتدا انقلاب فکر سے ہوتی ہے اور معاشی و معاشرتی انقلاب اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ انقلاب تقلید کے بندھنوں کو توڑ کر بجبر اندھوں کو کوئیں میں گرنے سے روکتا ہے اور ترقی اور تجدید کی راہ دکھاتا ہے۔ قرآنی یا کتابی انقلاب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کتاب و حکمت کی روشنی میں تجدید کو بے راہ روی سے نہ صرف بچاتا ہے بلکہ تخریب کو بھی تعمیر بنا دیتا ہے۔

قرآن حکیم نہ صرف پیغام انقلاب ہے بلکہ ذہنی اور معاشرتی انقلاب لانے کے مدارج بھی بتاتا ہے جس طرح نباتات حیوانات کے نشوو نما کے سلسلے میں عمر و ماحول کے اعتبار سے ان کی زندگی کے قوانین جلب منفعت و دفع مضرت بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ انسانی کی زندگی میں قوانین حیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انفرادی زندگی کے قوانین اجتماعی زندگی کے قوانین سے الگ ضرور ہوتے ہیں لیکن ان دونوں میں تضاد نہیں ہوتا۔ اسی طرح بچپن۔ طفولیت، نوجوانی۔ جوانی، کہولت اور بڑھاپے میں غذا اور تحفظ جسم کے قوانین اگرچہ اپنی نوعیت بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اصولی حیثیت سے ان سب کا مقصد جسمانی صحت کی ترقی ہوتی ہے۔

معاشرہ انسانی میں وہ کون سے امراض پیدا ہو گئے تھے جنھیں قرآن منقلب کر کے فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے پس منظر اسلام کا جاننا ضروری ہے۔ قرآن نے ایسا انقلاب لانے کا کیا طریقہ بتایا وہ قرآن کو تاریخی ترتیب ہی سے پڑھنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔ لہذا قرآن کو سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب سے پڑھئے۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قرآن کے مخاطب ان انقلابی تعلیمات کو کس طرح سمجھتے تھے، ان اقوام کے افکار و اعمال کا قرآن کے ساتھ ساتھ مطالعہ کیجئے۔ اس طرح آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ قرآن "بیان" للناس" ہے اور قرآن کریم یقیناً فہم و عمل انسانی کے لئے بہت ہی واضح اور آسان ہے۔

لیکن قرآن کو رسولؐ عربی کے زمانے کے منکروں نے ہی مہجور نہیں بنایا تھا، بعد میں پیدا ہونے والے مفسرین بالرائے نے تو اسے بالکل مبہم بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ عربی زبان کو خدا کی زبان قرار دیتے تھے۔ انھوں ہی نے قرآن کی اکثر آیتوں کو متشابہ المراد بنا دیا۔ حروف مقطعات اور بعض روحانی تصورات کے متعلق بھی یہی بتایا کہ ان کا مفہوم اللہ ہی سمجھے۔ عربی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد فارسی تفوق کے زمانے میں بخارا، غزنین اور دہلی نے جو خدمات اسلام کیں۔ ان میں سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ آرین تصورات کو عربی تصورات کے ساتھ قرآنی جامۂ انقلاب پہنا دیا اور مثنوی رومیؒ کو قرآن فارسی کا لقب ملا۔ آخر کار امام ولی اللہ رح دہلوی کے خاندان نے اردو کو بھی یہ شرف بخشا کہ وہ خدائی وحی کو بیان کر سکے۔

یاد رکھیئے کہ خدا کی کوئی خاص زبان نہیں۔ اس لئے خدا نے ہر قوم میں اسلامی تعلیمات اسی قوم کی زبان میں، اور اسی قوم کے انسان کے ذریعے بھیجی ہیں۔ اس لئے ہم ہر زبان کو خدائی زبان مانتے ہیں۔ اور پیغام ربانی لانے کی حیثیت سے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔

)

ضرورت ہے کہ قرآن اور دیگر کتب ربانی کے ترجمے دُنیا کی ہر زبان میں ہوں تاکہ حکمت الہیہ کو ہر شخص سمجھ کر اسلامی انقلاب میں شریک ہو سکے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ مفکرین قرآن پر عمل کرنے سے پہلے اس کو پورے طور پر سمجھ لیں۔ اور ان مفکرین سے قطعی اعراض کریں جو قرآن کو صرف پڑھنے پڑھانے کی چیز سمجھتے ہیں، اور اس کے بتائے ہوئے طریق انقلاب کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کرتے۔

قرآن و سیرت کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دُنیا اوہام میں پھنسی ہوئی تھی۔ پروہت اور ساحر انسانی عقول کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے اور معجزات و کرامات کے فریب میں پھنسا کر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے مارا کرتے تھے۔ اس قدامت پرستانہ عقل فروشی کو قرآنی تعلیم انقلاب نے قطعی ختم کر دیا۔ اس نے بار بار اور صاف صاف کہہ دیا کہ خدا نے رسولؐ عربی کو کوئی معجزہ نہیں دیا اور آنحضرت نے اپنے انقلابی طریقہ کار سے یہ ثابت کر دیا کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" یعنی انسان اپنے عمل ہی سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا

ہے۔ اور یہ وہموں اور ولیوں کے معجزات اور کرامات پر بھروسہ کرنا شرک کے مترادف ہے جب ان شفعار کے فریب سے مسلمان نکل گئے تو پکے موحد بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا پر کامل بھروسہ کرنے کی وجہ سے ان میں انتہائی خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی وہ پرانے وہموں کو چھوڑ کر اپنے بھروسے پر اور اللہ پر توکل کر کے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جاں فروش بن گئے۔ یہ ذہنی اور روحانی انقلاب تھا جو قرآنی تعلیم نے دنیا میں پیدا کیا۔

اسی انقلاب کا یہ اثر ہے کہ باوجود رجعت پسندوں اور قدامت پرستوں کی کوششوں کے دنیا میں حق پرستی باقی ہے۔ اور انشاء اللہ عالمگیر بن کر رہے گی۔ یعنی ذہنی انقلاب کی بنیادوں پر نئی کتابی آمریت قائم ہوگی اس میں مادیت بھی روحانیت بن جائے گی۔

جو نامسلمان عربی نہیں جانتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن کی محیر العقول انقلابی تعلیم کو اپنی اپنی زبانوں میں سمجھیں۔ خود مسلمان نوجوان بھی قرآن کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ اس کی مادری زبان میں پیش کیا جائے۔ اس لئے ہم عربی ممالک کے اہل علم حضرات سے اور دوسرے ممالک کے عربی داں طلبار سے درخواست کریں گے کہ وہ قرآن کے انقلابی پیغام کو مختلف ملکوں کی زبانوں میں عام کر دیں۔ تاکہ دنیا میں امن و ترقی کے راستے اس نہج پر کھل سکیں جسے آج سے تیرہ سو سال پہلے رسول عربیؐ نے تدریجاً کھولے تھے۔ اور جس میں اولی الامر کو اختیار تھا کہ ماحول کے اعتبار سے قرآنی انقلاب کے قوانین عدل و مساوات و ترقی کو معاشرۂ انسانی میں حسب ضرورت جگہ دیتے رہیں۔

محمد اجمل خاں

بیت الحکمہ۔ دہلی (ہند)
دوشنبہ ۱۴ راکتوبر ۱۹۵۲ء

۵

قرآن اور انقلاب

حافظا می خور و رندی کن و خوش باش وُلے — دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

قرآن نہ صرف قدیم کتب الٰہیہ کو ہدایت و نور قرار دیتا ہے'

ا۔ قرآن و سیرت :-

اور اُن کے لانے والوں کو خدائی پیغام لانے والا بتاتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ قرآن حکیم میں آدمؑ سے اب تک جتنے انبیاء و حکما گزرے ہیں اُن کی جملہ تعلیم کا الہامی کتاب میں تذکرہ ہے۔ چونکہ اس میں مدتسوں اور پر بہتوں کی خود ساختہ تعلیمات کی تردید بھی موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ جس قوم کی طرف قرآن کا روئے سخن ہو اُس کی پوری تاریخ پیش نظر رکھیں۔

سیرت نبویؐ اس اسلام کی تاریخ ہے جس کو رسول عربیؐ نے قرآنی وحی اور کتب الٰہیہ کی روشنی میں نئے سرے سے قائم کیا ہے۔ مقصد دعوت تو قدیم ہی ہے لیکن طریق کار جدید ہے۔ اس عمل نبویؐ کے سلسلے میں قرآن کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں بذریعہ وحی آپؐ کے قلب پر نازل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ وحیاں غیر متلو کہلاتی ہیں۔ اور ان کا درجہ بھی وہی ہے جو دیگر کتب و حکم الٰہیہ کا ہے۔ یہ بھی قرآن سے ماخوذ ہیں۔

قرآن اور دیگر کتب الٰہیہ :-

ہم جملہ کتب الٰہیہ قبل قرآن کو احادیث و سنن نبویؐ کا درجہ دیتے ہیں اور جرح و تعدیل کے بعد سنت نبوی کی طرح ہر کتاب اللہ کی تصدیق کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ خود قرآن بار بار یہی کہتا ہے کہ قرآن مصدق ہے کتب اوّلین کا۔

عبداللہؓ بن سلام یہودی عالم تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی برابر توراۃ پڑھتے رہے رسول اللہ کی اجازت تھی کہ ایک رات قرآن کی اور دوسری رات توراۃ کی تلاوت کیا کریں۔ (ذہبی تذکرۂ حفاظ)

قرآن اور دوسری قوم کے ہادی و رہنما:۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ ہر قوم میں اُن کی زبانوں میں ہدایت کرنے والے یہی بتانے آتے رہے ہیں کہ اللہ کے بندے بنو اور شیطان سے دور بھاگو (اعبدو اللہ واجتنبوا الطاغوت) اس لئے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ملک و قوم میں اللہ کا راستہ بتانے والے آتے رہے ہیں۔ (لکل قوم ھاد) ان من اُمّۃٍ الا خلا فیھا نذیر (الفاطر ع ۳)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ خدا پرستی کا پیغام دُنیا کو دیتے رہے ہیں وہ پیام کی نوعیت کے اعتبار سے سب برابر ہیں (لانفرق بین احدٍ من رسلہ) البتہ بعض کو پیغام پہنچانے میں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لئے انھیں ذاتی مجاہدہ و جہاد میں دوسروں پر فضیلت دی گئی۔

قرآن یعنی عالمی انقلاب کا پروگرام:۔ "مسلمان قرآن حکیم کو انسانیت کیلئے آخری پیام ربانی مانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس عقیدے کو آج کی ذہنیت سے قریب لانے کے لیئے قرآن دنیا کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام دیتا ہے۔" (مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پیش لفظ ترتیب نزول قرآن کریم۔ از مؤلف)

نصب العین:۔ "اس طرح مطالعہ کرنے والے کی فکری ضرورت کا خیال رکھا جائے تو سب سے پہلے اس تحریک کا نصب العین مقرر ہونا چاہیئے۔ جسے ہم ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ میں مضمر دیکھتے ہیں (ناظرین سے ہم سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس آیت کی تفسیر "ازالۃ الخفاء" کی جلد اوّل کے ابتدائی صفحات میں ضرور مطالعہ کریں)" (مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پیش لفظ ترتیب نزول قرآن کریم)

قرآن کا مقصد:۔ "قرآن کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کا حکم چلانے والی طاقتور حکومت پیدا کی جائے۔" (امالیٔ عبیدیہ۔ ج ۴۔ ص ۲۲۳۷)

"قرآن ایک نور ہے جو دُنیا سے ظلم (اندھیرا) دور کرنے آیا ہے۔ مگر اس کی برکت سے ظلمت کب دُور ہوگی، یہ اللہ ہی جانتا ہے .... جب تک نور و ظلمت موجود ہیں اُس وقت تک مسلمانوں (اہلِ کتاب۔ مؤلف) کا فرض ہے کہ وہ اس نور کو ظلمت پر غالب کرنے کی کوشش (جہاد) کرتے رہیں" (امالیٔ مولانا عبید اللہ۔ ج ۴۔ ص ۲۲۳۲)

جمہوریت (ری پبلک) یعنی کتابی آمریت:- جمہوریت اس طرزِ حکومت کو کہتے ہیں جس میں کسی تصور کے ماتحت حکومت چلائی جائے۔ یعنی اس میں کسی تصور یا نصب العین کی آمریت ہو۔ اسلامی جمہوریت میں قرآن و عمل نبوی کی پابندی لازمی ہے۔ چونکہ قرآن حکیم دیگر کتب الٰہیہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی جمہوریت کو کتابی آمریت کہنا زیادہ موزوں ہے، یا یوں کہا جائے کہ قرآن ایک کتابی پارٹی ڈکٹیٹرشپ کے ماتحت جمہوریت قائم کرنا بتاتا ہے۔

عوامی شورائیت (ڈیموکریسی) وہ پنچایتی حکومت جس میں سلطنت کا تمام کاروبار عوام کی کثرتِ رائے سے طے پاتا ہے اُسے عوامی آمریت یا مجارٹی کی آمریت کہنا چاہیئے۔ اس طرزِ حکومت میں کثرت آراء سے جو بات طے ہو وہی حق سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر حزبِ مخالف کا غلبہ ہو جائے تو وہ ناحق کو حق منوا دیتا ہے۔ یعنی اُصول کی جگہ کثرت آرائے انسانی کا فیصلہ ہی نافذ ہوتا ہے۔ قرآن کتابی شورائیت کی تعلیم دیتا ہے (یعنی ڈیماکریٹک ری پبلک)

علم و کتاب:- قرآن نے علم و کتاب کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ علم ہے جو خدا ہمارے حواس اور شعور کے ذریعے دیتا ہے۔ یہ علم پوشیدہ نہیں رکھا جاتا بلکہ عام کیا جاتا ہے۔ یہ نُور ہے۔

سحر و کہانت:- دوسرا علم وہ ہے جو شیطان دیتا ہے اور جسے کاہن و ساحر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ ظلمت ہے۔

انقلاب:- وہ طریقِ فکر و عمل ہے جس کے ذریعے انبیاء نے شک و ظلمت سے

نکال کر انسانی ذہن و روح کو نور سے روشناس کیا اور فکرِ انسانی میں یقین کی روشنی پیدا کی۔

اسلام کی نئی ترجمانی:- موجودہ عہد سائنٹیفک عہد ہے۔ اس عہد تک پہنچنے میں قرآن کی تعلیم کو بہت دخل ہے۔ چونکہ العوام کا الانعام بل ہم اضل ہیں۔ اسی لئے اسلامی تعلیم کی بنیاد ہی اس پہ ہے کہ ہر مسلم و مسلمہ کے لئے علم و شعور حاصل کرنا ضروری ہے۔ ظلمت سے نکالنے کے بعد جمہوریت کے لئے مرکزی تعلیم پھیلانے والی جماعت ضروری ہے۔ اسے قرآن نے حزب اللہ کہا ہے۔

انسان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دُنیا کو امن و ترقی کے راستے پر ڈالنے اور دُنیا والوں کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لئے معاشی، معاشرتی اور روحانی مشکلات کا حل سوچیں۔ مسلم یعنی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے ہر قوم کے بندگانِ خدا کا فرض ہے کہ وہ علمی مفکرین کی ایسی جماعت تیار کریں جو دنیا والوں کو افراط و تفریط سے بچا سکیں اور ایک ایسا عالمی نظامِ معاشرت پیدا کر سکیں جس میں ہر انسان نیک عملی اور ترقی پر خوش دلی سے "مجبور" ہو۔ ہندوستان میں حجۃ اللہ علی الارض شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب الٰہیہ اور سنت انبیاء کی حکمت کو سوسائٹی کے اونچے طبقے کے لئے پیش کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس فکر کو ہند کے عام لوگوں تک پہنچایا اور امیر المومنین سید احمد رائے بریلوی نے اس فکر کو عملی جامہ پہنایا۔ غرضیکہ دُنیا میں مختلف ملکوں میں یہ انقلابی تحریک کسی نہ کسی شکل میں پہنچتی رہی۔ ہمارے زمانے میں مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) نے کتابی انقلاب کو تاریخ اسلام کے مثالی دور سے مستنبط کر کے عہدِ حاضر کی زبان میں پیش کیا۔ بحمد اللہ ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد بانیان "حزب اللہ" میں سے موجود ہیں۔ اور ان کے چند ساتھی بھی زندہ ہیں جو دُنیا کو امن و ترقی اور روحانیت کی طرف لے جانے میں عملی جد و جہد میں مصروف ہیں۔

عالمی انقلاب (فرد اور قوم):- جماعتی ترقی فرد کی ترقی ہی سے ہو سکتی ہے اس لئے وہی نظامِ جماعت بہتر ہوتا ہے جو فرد کی فطری استعدادوں کو ترقی کی راہ پر لگائے۔ اور فرد و جماعت میں تضاد نہ

ہو۔ لیکن کوئی جماعت یا قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ ایسی قوموں میں
گھری ہوئی ہو جو جاہل و بے شعور رہوں۔ مطلب یہ ہے کہ قطرے کے لئے ضروری ہے کہ
ایسے قطروں سے گھرا ہوا ہو جو طاہر و پاک ہوں۔ ورنہ وہ خود بھی گندہ اور نجس ہو جائیگا
اسی لئے قومی انقلاب و ترقی کا ہمیشہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ اپنے نفع کے لئے عالمی انقلاب
یا طہارت کی کوشش کی جائے۔

دوسرے لفظوں میں اسلام انفرادی یا قومی اصلاح و ترقی کا نام نہیں۔ نہ چند
اخلاقی و سیاسی اصولوں کا نام ہے۔ بلکہ وہ ایسی قوم تیار کر دیتا ہے جس میں ایسا معاشی
نظام جاری ہو جو افراد کو بد اخلاقی و بے دینی سے روکے اور اسے نیک عمل بنا دے۔
اس معاشرہ، سلطنت یا قوم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس انقلاب کو عالمی بنائے۔ اور خود
اپنی جماعت سے ایسے افراد کو جو منکر مساوات و ترقی ہوں چھانٹتا رہے۔

یہ اللہ والے انقلابی پہلے اپنی ایک مرکزی جماعت بناتے ہیں۔ اس پارٹی یا جماعت
کے اندر شوریٰ یعنی جمہوری نظام جاری ہوتا ہے اور اس کا طرز عمل کتاب اللہ کی روشنی
میں آمرانہ ہوتا ہے۔ جب تک کہ پوری جماعت تعلیم و تربیت پاکر (جیسا کہ بیعت رضوان ۶ھ
کے بعد ہوا) حق پرست نہ بن جائے۔ اس وقت قومی جمہوریت قائم ہو جاتی ہے اور
رفتہ رفتہ عالمی جمہوریت کی کتابی علمبردار بن کر بین الملی جمہوریت ترتیب دیتی ہے۔

حزب اللہ یا مرکزی انقلابی پارٹی:- "انقلاب کے لئے ایک مرکزی جماعت مفکرین کی تشکیل ضروری
ہوتی ہے۔ اور جب یہ جماعت اس پروگرام کو چلانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے
تو اسے ہر نشیب و فراز میں مناسب تبدیلی کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں۔
"السابقون الاولون من المهاجرين والانصار، والذين اتبعوهم باحسان
رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" میں اسی جماعت کا اثبات مقصود ہے" (مولانا عبید اللہؒ
پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

"جن لوگوں کو المهاجرین کا لقب دیا گیا ہے وہ تو مکہ کے رہنے والے تھے۔

آپ تعجب کریں گے کہ مکہ کے الانصار بھی مکی زمانے میں ہی تیار ہوئے۔ انھیں دو عنصروں سے مستقل مرکزی جماعت بن سکی۔ جس نے مدینہ میں اسلامی حکومت پیدا کر دی۔"

(مولانا عبیداللہ رح۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

یہ انقلابی پارٹی انقلابی طریق کار پر عمل کر کے اپنا سیاسی غلبہ (آمریت۔ ڈکٹیٹر شپ) قائم کر لیتی ہے۔ لیکن یہ ڈکٹیٹر شپ کتب الٰہیہ کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے بعد ملک کی اقتصادیات پر قبضہ کر لینے کے بعد انسانی معاشرہ کو بجبر علم و دولت کے ذریعوں پر قابض کراتی ہے۔

حزب اللہ کا پارٹی پروگرام:- "قرآن کی متعدد سورتوں میں حزب اللہ کے لئے ایک پارٹی پروگرام تفصیلی احکام دے کر مکمل کر دیا گیا ہے۔" (مولانا عبیداللہ رح۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

ہم نے قرآن حکیم کو سیرت نبوی کے دس ادوار کے ساتھ ساتھ مرتب کر کے "سیرت قرآنیہ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں ابتدائے بعثت سے وفات نبوی تک کا پورا پروگرام موجود ہے، جو نصب العین کی روشنی میں مختلف اقوام اور مختلف حالات میں بدلتا رہا۔ لیکن خود نصب العین نہیں بدلا۔

انقلاب کیا ہے؟ "غلام کماتا ہے تو اس کی کمائی آقا کی ملکیت بن جاتی ہے خود اس کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہے۔ قیدی بھی جیل کے اندر کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ وہ جب تک جیل میں ہے ایک قسم کا غلام ہے۔

جب کسی سے کہہ دیا جائے کہ "یہ چیز تیری ہے" تو اس کے فکر میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اب وہ اپنی ملکیت کی حفاظت کرتا ہے۔ اور ضرورت پڑے تو اس کے لئے جان تک دے سکتا ہے۔ اس تبدیلی کا نام انقلاب ہے" (امالئی عبیدیہ۔ ص ۲۰۸)

خلاصہ یہ کہ ذہنی انقلاب کے بعد اقتصادی انقلاب وجوش عمل پیدا ہونا لازمی ہے (دیکھئے سیرت قرآنیہ مکیہ از مؤلف)

فاروق اعظم کے فیصلے کے مطابق سرمایہ پرستی کا قطعی استیصال اور ذرائع پیدا وار

پر قومی قبضہ انقلاب کی پہلی شرط ہے۔

انقلابی سوسائٹی:- "مرکزی پارٹی کے مفکرین کو دوسرے مرحلے میں ایسی سوسائٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو تمام انقلابی نظریات پر حاوی ہو۔ اس سوسائٹی کے کارکن جس وقت موقع دیکھتے ہیں انقلابی گورنمنٹ قائم کر لیتے ہیں۔ جو پرانی حکومتوں کو توڑتی اور اپنے پروگرام پر نئی حکومت پیدا کرتی ہے۔ اسلامی عقائد و اخلاق (یعنی تعلیمات قرآن قبل ہجرت) اور اسلامی حکومت (بعد بیعت رضوان) کی درمیانی کڑی اسی انقلابی سوسائٹی والے (یعنی موت پر بیعت کرنے والے رضوانی) ہوتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے احکام مشتبہ رہنے سے تسلسل فکر قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق سمجھنا ضروری ہے۔" (مولانا سندھیؒ۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

موت پر بیعت رسول جو تجھ سے موت کی بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ (قرآن)

بیعت رضوان کرنے والوں نے ۶ھ میں آنحضرتؐ کے ہاتھ پر موت پر بیعت کی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ فتح خیبر، فتح مکہ، فتح حنین اور پھر فتح عالم ہوئی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے وفات نبویؐ کے چند سال بعد شہنشاہ ایران کو اسی بنا پر دریائے فرات کے کنارے سے لکھا تھا کہ "اگر تو اسلام نہیں لاتا، یا اطاعت پر تیار نہیں ہے تو یاد رکھ کہ میں ایسی فوج کے ساتھ آ رہا ہوں جو موت کو اتنا ہی عزیز رکھتی ہے جتنا کہ تو زندگی کو" (پیام خالدؓ ص ۱۳۳ج۶)

قرآنی جبر یا ڈکٹیٹر شپ:- "غلامی جب طبیعتوں کی عادت ہو جائے تو انھیں جبراً آزادی دینا پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ربا کو بھی بجبر بند کر دیا جائے، یہ دو قانون، سرمایہ داری ختم کرنے کے لئے کافی ہیں یہ ہے اسلام کا انقلاب جسے امام ولی اللہ کا فلسفہ اپنی اساس قرار دیتا ہے۔"

(امالی مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ ج ۴۔ ص ۱۸۷۵)

نبی کا کام:- نبی کو اللہ کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ وہ اجتماع انسانی میں ایسا دستور زندگی رائج کرتا ہے جس سے انسان ترقی کی راہیں تیزی سے طے کرنے لگتا ہے۔

رسولِ عربی کی بعثت کی غرض:- بقول امام ولی اللہ العمری دہلوی (۱۷۰۳ - ۱۷۶۳) آنحضرت کے مبعوث ہونے کی غرض یہ تھی کہ دُنیا میں ان تمام ظالمانہ نظاموں کے خلاف جہاد کریں جو انسانی معاشرہ کو بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔" (امام ولی اللہ رح کارل مارکس سے سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے)

آنحضرت نے اسی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مجاہدوں کی وہ جماعت تیار کی تھی جو حزب اللہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور جس نے حزب الشیطان کو صراطِ مستقیم پر لانے اور دنیا میں عدل و قسط کے قیام کے لئے ہر ممکن جہاد کیا۔

قرآنی انقلاب کی منزلیں جب دولت ایک چھوٹے سے طبقے میں محدود ہو جاتی ہے تو معاشی بدحالی کی وجہ سے انسان کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شیطانی طریقوں سے زندہ رہنے کے منصوبے تیار کرنے لگتا ہے (کاد الفقر ان یکون کفراً) لہٰذا تاریخ امم کی روشنی میں آنحضرت نے نوعِ انسانی کو تنگدستی و معاشی بدحالی سے نکلنے کی صراطِ مستقیم دکھائی۔ نعمت الٰہیہ (عزت یعنی حریتِ ذہن و معاش، اور قیام دولت کتابیہ) کے لئے انقلاب کا نصب العین خدا پرستی کو قرار دیا۔ حصول نصب العین کے لئے۔

۱۔ پہلے دعوت سراً دی۔ یعنی خواص کی ایک مرکزی خفیہ پارٹی بنائی۔

۲۔ پھر دعوت جہراً دی۔ یعنی انقلابی پروگرام کو قریش کے سامنے رکھا۔ جس میں کہ تکذیب و استہزا کا پامردی سے مقابلہ کیا گیا۔

۳۔ اس کے بعد نصاریٰ کو دعوت اتحاد دی۔ اور ہجرت حبشہ کی گئی۔

۴۔ قبائل حول المکہ کو انقلابی پیغام پہنچایا (بعد شعب ابی طالب)

۵۔ بنو اسرائیل مدینہ کو دعوت دی گئی اور اوس و خزرج میں سے انقلابی پیدا کئے گئے۔ (بعد شعب ابی طالب)

۶۔ ہجرت مدینہ کے بعد مرکز انقلاب مدینہ قرار پایا۔ اور آنحضرت مہاجرین و انصار و یہود کے امیر بن گئے۔

۷۔ سنہ ۶ھ میں بیعت رضوان کے بعد ایک ایسی قومی جماعت تیار ہوگئی جو عالمی انقلاب

کے لئے مرنے پر بیعت کر چکی تھی ۔

۸۔ فتح مکہ کے بعد عالمی پروگرام پر تیزی سے عمل ہونے لگا ۔ اور پھر جیش اسامہؓ تیار ہوا ۔

۹۔ پھر وفات نبوی کے بعد رفقائے رسولؐ نے دولت کتابیہ کو بہت وسعت دی ۔

مندرجہ نکات سیرت نبوی کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہیں

ابتدائے تمدن سے دین واخلاق کا انسانی معیشت ومعاشرت سے گہرا تعلق رہا ہے لیکن خودغرض پروہتوں، کاہنوں اور نام نہاد طبیبوں نے اپنی معلومات کو راز میں رکھنا مفید سمجھا۔ اور بادشاہوں یا سرداروں اور مالداروں کے نفع کے لئے قانون سازی شروع کی جانوروں اور انسانوں کی قربانی سے اچھے اور بڑے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے طریقے رائج کئے ۔ اسی طرح اپنی قوم کو ذہنی غلام اور اجنبی قوم کو جنگ کے ذریعے جسمانی غلام بنانے لگے ۔ پھر اپنی ہی قوم کی عورتوں کو مذہب کے ذریعے اور مردوں کو سود کے ذریعے غلام بنانے کے قانون بنانے لگے ۔ اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں، اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے لگے ۔ تاکہ مساوات ومحبت کا پیغام عوام تک نہ پہنچے ۔

اس پس منظر میں رسول کریمؐ کی سیرت میں مندرجہ ذیل واقعات سے آپ اسلامی انقلاب کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں ۔

سنہ ۱ محمدی	سنہ ۵۷۰ مسیحی	پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیمی کے مدرسہ میں تعلیم سے خود اعتمادی کی عادت پیدا ہوتی ہے ۔
سنہ ۱۲ "	سنہ ۵۸۲ "	سفر شام میں نصرانی تمدن اور راہبوں کی خوش اخلاقی سامنے آتی ہے ۔
سنہ ۲۵ تا سنہ ۴۰ محمدی	سنہ ۵۹۵ تا سنہ ۶۱۰ مسیحی	پندرہ سال تک کل عرب اور اقوام کا تجارتی

		سفروں میں مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مالدار پروہت اور امیر ہر جگہ ظالم اور تنگ نظر ہیں وہ علم اور دولت کو عام نہیں کرنا چاہتے۔
سنہ ۴۱ محمدی	سنہ ۶۱۰ عیسوی	صرف ایک عظیم آقا کو مان کر علم و عقل کو عام کر لے، اور دولت کو صرف پروہتوں اور رئیسوں تک محدود نہ رکھنے کے لئے خفیہ سوسائٹی کی تاسیس۔ (نبوت اور انذار کی ابتدا)
سنہ ۴۵ محمدی	سنہ ۶۱۵ء	ہجرت حبشہ۔ رحمانان پرست نصرانیوں سے دوستی ہوتی ہے۔
سنہ ۵۳ محمدی	سنہ ۶۲۳ء	سورہ بنو اسرائیل کے خواب اور ہجرت مدینہ کے بعد کتابی آمریت کے قیام کے لئے یہود سے دوستانہ معاہدہ ہوتا ہے۔ نماز فرض ہوتی ہے۔ تعمیر مسجد اللہ۔
سنہ ۵۹ محمدی	سنہ ۶۲۹ء	قریش، احبار یہود اور منافقین مدینہ کی شرارتوں کے باوجود حدیبیہ میں انقلابی کتابی جماعت کی پیدائش و قیام۔
سنہ ۶۳ محمدی	سنہ ۶۲۳ء	حج اکبر میں آزادی عقل و ضمیر، آزادی زن و غلام و مسکین کا اعلان، اور ایسی کتابی آمریت کا قیام جو جمہور کو مجبوراً آزاد اور مالدار بنا دے اور عقلی بنیادوں پہ کہانت و پروہتی کو ختم کرکے اصولی یعنی جمہوری یا کتابی آمریت پہ عمل کرے۔

ترتیب نزول قرآن کے بغیر قرآن و سیرت نبوی عسیر الفہم بن گئے ہیں

ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

قرآن حکیم سلہ نبوی سے ۲۳ نبوی تک رسول عربی صلعم کے قلب پر معناً نازل ہوتا رہا۔ اور رسول کریمؐ اس کے احکام و دلائل (آیات) کو مختلف قوموں تک پہنچاتے رہے۔ قرآن کریم کے مختلف ادوار کو تاریخی ترتیب سے پڑھا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے لئے آپ نذیر و منذر تھے۔ یعنی یوم البعث کی سزا اور موجودہ دنیا کے عذاب سے خبردار کرتے تھے۔ اس کے بعد قرآن نے آپ کو بشیر و مبشر کا لقب دیا۔ جو نصرانی قوموں میں مسیح کے لئے رائج تھا۔ اسی دور میں "رحمان" و نصرانیت کا ذکر زیادہ ہے یعنی روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے۔ شعب ابوطالب سے ۱۰ نبوی میں نکلنے کے بعد آپ کا روئے سخن بنو اسرائیل اور مجوس وغیرہ کی طرف زیادہ ہے۔ اور اسی زمانے سے رؤیائے اسرا کا تعلق ہے۔ اور سیروا فی الارض پر زور ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہجرت کرنا چاہیئے۔

ہجرت مدینہ کے بعد مختلف غزوات کے اشارات اور معاشرتی زندگی کے احکام پائے جاتے ہیں۔ ان کی ترتیب بھی علماء کو معلوم ہے۔

موجودہ مصحف میں حضرت زیدؓ بن ثابت نے صحابہ سے مشورے کے بعد جو ترتیب سور قائم کی ہے اس میں قرآن کو تاریخی ترتیب سے درج نہیں کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے قرآن کو تاریخی ترتیب سے مدون کیا تھا۔ اور اکثر مہاجرین چونکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے وہ قرآن کی تاریخی ترتیب سے واقف تھے۔ انھوں نے مدینہ والوں کو بھی بتایا تھا کہ مکہ میں قرآنی تعلیم یہ تھی۔ ان میں سب سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر آنحضرتؐ کے رسول بن کر مدینہ آئے تھے اور انھوں نے

اوس و خزرج کو گھر گھر جا کر مکی قرآن کی تعلیم دی تھی۔

ہجرت مدینہ کے بعد رسول اللہؐ پر جو قرآن نازل ہوا، وہ ایسا تھا کہ اُس کے بعض احکام مکی سورتوں میں نہ تھے۔ اس لئے جب قتال فرض ہوئی، یا دوسرے احکام زکوٰۃ و حلال و حرام نازل ہوئے تو وہ مکی سورتوں میں بھی حسب موقع بڑھائے گئے یہ آیات سب صحابیوں کو معلوم تھیں۔ اور ہمارے پاس کافی روشنی موجود ہے جس سے ہم مکی اور مدنی آیتوں کو الگ کر لیتے ہیں۔

موجودہ مصحف عثمانی اُن صحابیوں یا تابعین کے لئے تو نہایت موزوں تھا جو خود اُس کش مکش سے گزر چکے تھے، جس میں سے آنحضرتؐ اور اُن کے رفقاء گزرے تھے لہٰذا وہ جس ترتیب سے بھی قرآن پڑھتے پڑھ سکتے تھے۔ اسی لئے حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کی ترتیب، حضرت اُبی بن کعب کی ترتیب سے مختلف تھی صحابیوں کے پاس مختلف ترتیبوں سے قرآن موجود تھا۔ یہی حال رسول اللہ صلعم کی وفات کے بیس سال بعد تک رہا۔

آذربائیجان کی لڑائی میں اختلاف ترتیب کی وجہ سے مسلمانوں میں جھگڑا پڑا، تو حضرت عثمانؓ نے سورتوں (اور سورتوں میں رکوعوں) کی ترتیب مقرر کرا دی۔ اور یہ خیال رکھا کہ پہلے لمبی سورتیں ہوں، پھر مئین یا سو آیتوں والی اور ان کے بعد مفصل یا مختصر سورتیں لکھی جائیں۔ اس ترتیب کو سرکاری طور پر رائج کر دیا گیا، اگرچہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کو اس سے اختلاف رہا اور وہ اپنی ہی ترتیب قرأت پر قائم رہے اور لوگوں کو پڑھاتے رہے۔

ہمارے لئے، یا ان لوگوں کے لئے جو اسلام کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنا چاہتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ترتیب نزول قرآن کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کی عملی زندگی سامنے آئے۔ اس لئے اسلام کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے مصحف عثمانی کی ترتیب قرآن و سیرت کو عسیر الفہم بنا دیتی ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں سیکڑوں فرقے پیدا ہو گئے ہیں، اور اصل تعلیم اسلام مفقود ہو گئی ہے۔

ترتیب آیات فی السُّوَر: یہ تو امر مسلمہ ہے کہ مختلف آیات و الفاظ کو رسول اللہؐ نے حکم الٰہی سے مختلف سورتوں کے اندر بعد میں بڑھائے اکثر مکی سورتوں میں قتال و زکوٰۃ کے متعلق جو احکام بڑھائے گئے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں. مثلاً سورۃ المزمل میں پہلے قتال کا ذکر نہ تھا یہ سورہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے. اس کے بارہ سال بعد ۲ھ میں جب قتال فرض ہوا تو ترتیب آیات فی السور میں رسول اللہؐ نے قتال و زکوۃ کا ذکر اس طرح بڑھایا: ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثي الليل نصفه وثلثه وطائفة من الذين معك ط والله يقدر الليل والنهار ط علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقرأوا ما تيسر من القرآن ط علم ان سيكون منكم مرضى وآخرون يضربون في الارض يبتغون من فضل الله (وآخرون يقاتلون في سبيل الله) فاقرأوا ما تيسر منه واقيموا الصلوٰة (وآتوا الزكوٰة واقرضوا الله قرضاً حسناً) ٥

اسی طرح سورۃ الاعلیٰ میں سنقرئك فلا تنسى کے بعد (الا ما شاء الله) بعد میں بڑھایا گیا. تاریخ و احادیث سے یہ سب آیتیں معلوم ہو سکتی ہیں اس سے ثابت ہے کہ سورتوں میں نظم آیات قرآنیہ رسول نے دی ہے۔

اس کے علاوہ تلك الغرانيق العلى کی بحث کے سلسلے میں بھی جو آیت رسول اللہؐ نے (خدا کے حکم سے) اجمال کی تفصیل کے لئے بڑھائی ہے وہ بہت بعد کی ہے. اگر آپ اس سورہ کی مختصر آیتوں اور ردی پر نظر ڈالیں گے، اور پھر تشریحی آیت کو دیکھیں گے تو یہ مسئلہ صاف ہو جائیگا (دیکھئے سورہ والنجم)

افرأيتم اللّٰت والعزّى ٥

ومنوٰة الثالثة الاُخرى ٥

الكم الذكر وله الاُنثى ٥

تلک اذاً قسمۃٌ ضیزیٰ ○

(ان ھی الا اسمآءٌ سمیتموھا انتم و اٰباءکم ما انزل اللہ بھا من سلطٰن ان یتبعون الا الظن و ما تھوی الانفس ج)

ولقد جاءھم من ربھم الھدی ○

اسی طرح جب بہت ہی ابتدائی سورت یعنی المدثر میں تسعۃ عشر کا لفظ آیا تو مستہزئین مذاق اڑانے لگے کہ ہم ہزاروں ہیں، انیس فرشتے ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس پر جو تشریحی آیت نازل ہوئی ہے وہ بعد کے زمانے کی ہے اور ان مختصر آیتوں سے بالکل الگ معلوم ہوتی ہے جن میں ابتدائی مکی قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اصل میں علیہا تسعۃ عشر کے بعد و ما ھی ذکری للبشر تھا۔

آیات یہ ہیں:-

ساصلیہ سقر ○

وما ادرٰک ما سقر ○

لا تبقی ولا تذر ○

لوّاحۃٌ للبشر ○

علیہا تسعۃ عشر ○

(وما جعلنا اصحاب النار الا ملٰئکۃً، وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ للذین کفروا، لیستیقن الذین اوتوا الکتٰب ویزداد الذین اٰمنوا ایمانا ولا یرتاب الذین اوتوا الکتٰب والمؤمنون لا ولیقول الذین فی قلوبھم مرضٌ والکافرون ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً ط کذالک یضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء ط وما یعلم جنود ربک الا ھو ط)

وما ھی الا ذکریٰ للبشر ○

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن ایک فرشتہ کے ذریعے سے قلب رسول ؐ پر حسب ضرورت وحی ہوتا تھا۔ انہ لقول رسول کریم (سورۃ التکویر) وما صاحبکم بمجنون (یعنی رسول اللہ ؐ پر جن نہیں آتا جیسا کہ شاعروں اور ساحروں پہ آتا ہے، بلکہ یہ قول فرشتہ کا ہے شیطان کا نہیں ہے۔ (وماھو بقول شیطٰن رجیم) اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ ان ھو الا ذکرٌ للعٰلمین۔ (سورۃ التکویر)

اختلاف ترتیب سُوَرْنہ کہ اختلاف تلفظ: بعض مفسرین بالرائے نے پورے قرآن کو مشتبہ قرار دینے کے لئے یہ کہا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں اختلاف قرأت سے مراد اختلاف تلفظ ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے۔ اور تلفظ قریش پر حضرت زیدؓ بن ثابت کو قرآن لکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو سوال یہ ہے کہ انھوں نے وہ قرآن کس تلفظ کے ساتھ لکھا تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں سرکاری طور پر دو دو شہادتوں کے بعد جمع ہوا تھا۔ اور وہ قرآنی نسخے کیا ہو گئے تھے جو مختلف کاتبوں کو رسول اللہ ؐ خود اپنی زبان مبارک سے لکھوا گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکڑوں حفاظ قرآن بھی موجود تھے اور "ناول فا الاول" کے اعتبار سے مہاجروں نے قرآن کو ترتیب نزول کے اعتبار سے بھی یاد کر رکھا تھا تحریر کا اتنا سوال ہی نہیں تھا کہ لفظوں اور اعراب کے جھگڑے شروع ہوتے خود رسول اللہ ؐ اور اجل قراء موجود تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وحی متلو کا تلفظ بدل جاتا اور لوگ یتامیٰ کو ایامیٰ (وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ) قصاص کو قصص (ولکم فی القصاص حیاۃ) عزت کو غرۃ (بل الذین کفروا فی عزۃ وشقاق ۳۸:۲) کہنے لگتے۔ یا یہ کس طرح ممکن تھا کہ حافظان قرآن اصل الفاظ قرآنیہ کی جگہ اُن الفاظ کا مفہوم یا مترادف لفظ پڑھتے یا کمی زیادتی کر دیتے۔ مثلاً وانذر عشیرتک الاقربین کے آگے

26:214

(ور ھطلك منھم المخلصین) بڑھا دیتے۔ یا و الیل اذا یغشی میں صرف (والذکر والانثی) پڑھتے اور (ماخلق) کو کم کر دیتے اور کہتے کہ یہ ابن مسعودؓ کی قرأت ہے یا تقدیم و تاخیر کرکے جاءت سکرۃ الموت بالحق کو (جاءت سکرۃ الحق بالموت) کر دیتے۔ اور والعھن المنفوش کی جگہ والصوف المنفوش پڑھنے لگتے۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی حدیثیں اور تفسیر بالرائے کرنے والوں کی بنائی ہوئی مثالیں ہیں۔ بہرحال یہ ممکن ہے کہ طلح منضود کو ایک قبیلہ طلع منضود کہے یا قاف کو غا یا کاف کہے جیسا کہ حیدرآباد یا پنجاب والے ادا کرتے ہیں مگر اس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ لاکھ قاف لکھیں ایک پنجابی یا ترک کاف کہے گا۔ ایک مصری جیم کو گاف اور ایک ایرانی قاف کو غین بولے گا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اسی قرأت لفظی میں صحابہ کرامؓ کے پاس بالکلیہ محفوظ تھا جن میں رسول اللہؐ نے وحی الٰہی کے بعد تلاوت کیا تھا۔ آپؐ افصح العرب تھے اور یہ ناممکن تھا کہ قریش ان الفاظ کو بدل دیتے یا سات طرح سے تلفظ کرتے۔ اور کتابت میں تو یہ قطعی ناممکن تھا کہ رسول اللہؐ کے تلفظ کو کسی طرح بدلا جا سکتا۔

اصل میں اختلاف قرأت اس میں تھا کہ کوئی کسی سورہ کو پہلے پڑھتا تھا کوئی کسی کو۔ ہر صحابی اپنی پسند اور ضرورت کے اعتبار سے سورتوں کے مجموعے بنائے ہوئے تھا۔ پورا قرآن کسی ایک ترتیب سے کسی کے پاس نہ تھا۔ البتہ مختلف لوگوں کو پورا یاد تھا۔ اسی کو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کرا کے تلفظ قریش نہیں بلکہ تلفظ رسولؐ کے مطابق رکھ لیا تھا جو مروان بن الحکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے لے کر ضائع کر دیا۔

کلام رحمان اور القائے شیطان

ما محمد الا رسول، قد خلت من قبله الرسل ۰ 3:14	محمدؐ رسولوں میں سے ایک ویسے ہی رسول ہیں جیسے پہلے گزرے ہیں۔
ھذا نذیر من النذر الاولی ۰ (النجم) 53:5	محمدؐ ویسے ہی نذیر ہیں جیسے پہلے گزرے۔
ما کنت بدعا من الرسل ۰ 46:9	محمدؐ کوئی انوکھے رسول نہیں ہیں۔

وہ کلام جس میں رحمت و ہدایت ہو رحمانی و ربّانی ہے۔ بخلاف اس کے جس کلام میں ظلمت وضلال کی تعلیم ہو وہ شیطانی ہے۔

منطقی بنا لیتا ہے اور سحر و کہانت کی طرح راز میں نہیں رکھتا، وہ وحی یا الہام ہے۔ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم یا نیکی کے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ "وسواس الخناس" جو پروہتوں اور ساحروں کی آمدنی کا ذریعہ بن کر لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور جن کو ساحر وغیرہ راز میں رکھ کر تنقید و نظر سے دور رکھتے ہیں، وہ سب الہامات شیطان ہیں۔ اسی کی تفصیل ن والقلم وما یسطرون سے آگے کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نوحؑ کے زمانے سے یہی طریقہ وحی رہا ہے کہ سچا علم خدا دیتا ہے۔ (انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین بعدہ) ظاہر ہے کہ قلم کا استعمال حضرت نوحؑ کے وقت میں نہیں تھا۔ قلم سے مراد یہی ہے کہ وہ علم جو نقد و نظر کی کسوٹی پر پورا

اُترتے اور آشکارا ہو۔ راز میں نہ رکھا جائے۔ ورنہ وہ سحر ہے۔ اسی لئے کفار قریش جو وحی الٰہی کو نہیں مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ قرآن سحر ہے، اور کلام بشر ہے (ان ھذا الا سحر یؤثر۔ ان ھذا الا قول البشر) وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جس طرح ہمارے ساحروں اور کاہنوں کو شیاطین وجنات کلام سکھاتے ہیں اسی طرح کا کلام قرآن بھی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی۔ یہ کلام شیاطین نہیں بلکہ کلام روح الامین ہے، جو خدا بھیجتا ہے۔ اور اس قلبی وحی کو رسول اللہؐ صاف اور سلیس زبان (عربی مبین) میں لوگوں کو سناتے ہیں: وانہ لتنزیل رب العالمین ۰ نزل بہ الروح الامین، علی قلبک لتکون من المنذرین، بلسان عربی مبین ۰ (الشعراء ۱۹۲ - ۱۹۵) پھر اس کے بعد ہی وحی بالفظ کی تردید کردی اور یہ بتایا کہ یہ ویسا ہی بالمعنی کلام ہے جیسا کہ گزشتہ کتابوں میں آچکا ہے، حالانکہ اُن معانی کے الفاظ راویوں نے بتائے ہیں فرمایا کہ "وانہ فی زبر الاولین" (۱۹۶) اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ کلام ربانی ہے کلام شیطانی نہیں ہے ما تنزلت بہ الشیاطین (۲۱۰) وہ تو اس کلام کو سن ہی نہیں سکتے۔ انھم عن السمع لمعزولون (الشعراء ۲۱۲)

تنزیل ربانی اور خطوات الشیطان: غیب یعنی چھپی ہوئی حقیقتوں سے جو

خیالات وتصورات پیدا ہوتے ہیں یا جو احساسات جاگ اٹھتے ہیں انھیں عربی زبان میں وحی والہام کہتے ہیں۔ ان عواطف و امیال کو انسان و حیوان دونوں کسی نہ کسی طرح ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ عموماً انسان کا ذریعۂ اظہار نطق ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب تک کوئی زبان ایسی نہیں بنی جو انسان کے محسوسات کی صحیح اور پوری ترجمانی کر سکے۔ اس لئے اپنے محسوسات و عواطف کے اظہار اور شعر و ادب کے نقص کو پورا کرنے کے لئے انسان نے

نطق و گویائی کے دوسرے ذریعے بھی ایجاد کئے ہیں، جنھیں فنون لطیفہ کہتے ہیں۔ یعنی جو کام شاعر و ادیب اپنی زبان سے لینا چاہتا ہے اُسی کو مصوّر و نقاش خطوط و الوان سے معمار و سنگتراش سنگ و خشت سے اور مغنی و موسیقار اپنی آواز سے لینے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنی تخلیق میں خواہ وہ شعر ہو یا تصویر عمارت ہو یا نغمہ اپنے قلب کی ان الہامی کیفیتوں کو بھرنا چاہتا ہے جنھیں وہ محسوس کرتا ہے، اور پھر یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس تخلیق کے دیکھنے یا سننے والوں پر بھی وہی وجدانی کیفیت طاری ہو جائے جو خود اُس پر ہوئی ہے۔

رسول عربیؐ نے قرآن کے ذریعے بتایا کہ وحی و الہام کی کیفیتیں رحمانی بھی ہوتی ہیں اور شیطانی بھی۔ رحمانی وحی تاریکی سے روشنی کی طرف، ضلال سے ہدایت کی طرف اور خوف سے امن و اطمینان کی طرف لے جاتی ہے۔

خطوات شیطان یا شیطانی القا اس کی ضد ہوتا ہے۔ چونکہ عربوں کے شاعر، ساحر، کاہن اور نجومی یہ دعوے کیا کرتے تھے کہ ان کو بھی غیب کا شعور و علم ہوتا ہے اور یہ علم شیاطین و اجنہ یعنی وسواس الخناس یا رئی یا تابع من الجن کے ذریعے سے ہوتا ہے، اس لئے قرآن نے ان کے سحر و شعر و کہانت کو شیطانی کہا۔ اور بتایا کہ سچے اور حقیقی علم کا سرچشمہ اللہ ہے وہی انسان کو سچّا علم دیتا ہے۔ علم الانسان ما لم یعلم ۝ الرحمان علم القرآن ۝ اور علم الانسان بالقلم پر غور کیجئے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ "وحی" یا اشارۂ خفی جو خدا کی طرف سے (من عند اللہ) ہوتا ہے، وہ بے لفظ و صوت ہوتا ہے، اور انسان کے دل میں ایک کھٹک محسوس ہوتی ہے، جسے وہ اپنے الفاظ میں یا فنون لطیفہ کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ

اللہ کسی بشر سے کلام نہیں کرتا، البتہ وہ وحی (یا اشارۂ خفی) یا پردے کے

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ ○ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ وَمَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنَاہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ صِرَاطِ اللّٰہِ ۔ ۴۲ : ۵۲

پیچھے سے کلام (دل میں کھٹک) پیدا کرتا ہے، یا وہ کوئی ایلچی (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اُس کی مرضی وحی کرتا ہے، وہ اللہ برتر و حکیم ہے (حکمت وحی وہی جانتا ہے) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تجھ پر روح (وحی یا فرشتہ) بھیجی، حالانکہ تو نہ الکتاب (علم و قانون) کو جانتا تھا اور نہ الایمان (باللہ و بعث بعد الموت) کو۔ ولیکن ہم نے اس وحی کو نور بنادیا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں جن کی ہدایت چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اور یقیناً تو بھی صراط مستقیم کو اس کے ذریعے سے بتاتا ہے۔ وہ صراط مستقیم اللہ کی شاہراہ ہے۔ (آخر سورۂ شوریٰ)

اسی طرح قرآن نے بتایا کہ ہر قوم خدائی پیغام یعنی خدا پرستی کا پیغام لانے والے یہی کہتے رہے ہیں (ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ سورۃ النحل) پھر فرمایا :-

وانہ لتنزیل رب العالمین ○ نزل بہ روح الامین علی قلبک ○ (الشعراء)

یہ تنزیل قوموں کے آقا کی طرف سے ہے۔ جو روح الامین کے ذریعہ قلب رسول پر نازل ہوتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وحی من جانب اللہ ہوتی ہے۔ اللہ براہ راست نبیوں سے کلام نہیں کرتا۔ بلکہ بذریعہ تنزیل کرتا ہے یعنی دل میں ایک بات پیدا کر دیتا ہے، انشراح صدر ہو جاتا ہے، دل میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر اس پیغام کو اپنے الفاظ میں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ نزول کے معنی بھی پیدا کرنے کے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ باْس شدید....... (سورۃ الحدید رکوع ۳)

ہم نے اپنے ایلچی نشانیاں دے کر بھیجے اور پیدا کیا (انزلنا) ان کے ساتھ قانون (کتاب) اور عدل (میزان) تاکہ لوگ انصاف پہ سیدھے رہیں۔ اور ہم نے لوہا پیدا کیا (انزلنا) جس میں سختی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جو وحی رسول اللہؐ کے قلب پر نازل ہوتی تھی، وہ اللہ کے پاس سے (من عند اللہ) ہوتی تھی اور خدا اور اس کے فرشتے (رسل اولی الاجنحہ) شاہد ہیں کہ یہ وحی خدا کے پاس سے لاکر قلب رسولؐ تک پہنچاتے ہیں (لٰکِنِ اللّٰہُ یشھد بما انزل الیک انزلہٗ بعلمہٖ ج والملائکۃُ یشھدون ط وَ کَفٰی باللّٰہِ شَھِیْداً۔ النساء ۱۶۶)

قرآنی وحی ویسی ہی وحی من جانب اللہ ہے جیسی کہ نوحؑ اور دوسرے نبیوں پر وحی ہوا کرتی تھی۔ کسی کو خواب دکھائی دیتا تھا، کسی کے دل میں ہدایت راہ پاتی تھی وغیرہ۔ (انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوحٍ والنبیین من بعدہٖ)

اس کلام من عند اللہ کو کلام اللہ اور قول اللہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے معنی امر اللہ کے بھی ہیں۔ جیسا کہ زمین و آسمان کو حکم بذریعہ وحی دیا گیا، (وقیل یا ارضُ ابلعی ماءَکِ، ویا سماءُ اقلعی۔ سورۂ ھود ۴۴)

غرضکہ ان تفصیلات سے جو قرآن میں پائی جاتی ہیں ربانی وحی کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک صاحب اختیار اور ذی شعور مخلوق (جن والنس) کے لئے ہے۔ اور دوسری جمادات و نباتات و حیوانات کے لئے ہے۔ مثلاً اَوْحَیْنَا اِلَی النحل، اور ارض و سما، وحش و طیور کے متعلق کہا گیا کہ (مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِہٖ) وہ امر الٰہی یعنی وحی و حکم الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتے "طوعاً وکرھاً" "سجدہ" یعنی طاعت پر مجبور ہیں۔

ذی شعور انسانوں اور جنوں پر اُن ہی کی قوم کے لوگوں اور ان کی زبانوں کے ذریعے خدائی پیغامات پہنچائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں اختیار دیا گیا ہے، اور اختیار کے ساتھ ساتھ اخلاقی ذمہ داری اور جزا و سزا کی خبر بھی دی گئی ہے، اس لئے ثقلین (جن و انس) وحی الٰہی پر چلنے کے لئے غیر ذی شعور مخلوق کی طرح مکلف نہیں ہیں۔ انھیں اختیار ہے کہ وہ "طاغوت" سے "اجتناب" نہ کریں۔

عرب کے شاعر، ساحر اور کاہن قرآن کو بھی اُسی طرح "قول شیطان رجیم" کہتے تھے جیسا کہ خود ان کے ساحروں یا شاعروں اور کاہنوں کا کلام ہوتا تھا۔ وہ اللہ اور شیطان میں رشتہ جوڑ چکے تھے اور اپنی دیویوں کو بنات اللہ اور جنّیہ کے بطن سے تولد ہونا قرار دیتے تھے۔ یعنی اللہ اور شیطان دونوں کو شریک کرکے دونوں کی پرستش میں اپنا فائدہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے اس شرک کو بھی ختم کیا اور بتایا کہ ذریعۂ علم شیاطین و جن نہیں ہیں، نہ لات منات، عزیٰ وغیرہ ہیں بلکہ علم کا سرچشمہ اللہ ہے اور وہ مشخص خدا یا دیوتا نہیں کہ براہ راست کسی انسان سے کلام کرے۔ اس کا کلام خفی دل میں خیالات موجزن کرتا ہے، جنھیں رسول یا نبی اس قوم کی زبان میں مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن کے مخاطب کا ذہنی پس منظر اور اس کی زبان کا وہ مفہوم جو مخاطب کے ذہن میں ہوتا ہے، ہر مفسر کے لئے جاننا ضروری ہے۔

قرآنی الفاظ رسولؐ کے ہیں:

امام ولی اللہؒ محدّث دہلوی نے اس خیال کو کہ معنی اللہ کی طرف سے رسولؐ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور الفاظ خود رسولؐ کے ہوتے ہیں، اس طرح بیان کیا ہے:-

"فمن ذلک (ای من اللدنیات) القرآن العظیم وذالک ان الفاظ	قرآن عظیم خدا کی نزدیکی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے الفاظ عربی

القرآن انما هي من لغة العرب
التي يعرفها محمد صلعم ويتخيلها
والمعاني فائضة من الغيب
تعليماً له صلعم تدليّاً الى الخلق
فهو صار كلاماً الهيا. انما صار
لأنّ ارادة الخير بالناس
امتدت في خياله عليه السلام
فهي التي جمعت الالفاظ
ونظمها ثم امدّ في هذا
النظم فالبس لباساً محاكياً
للجبروت فصار بذلك تدليّاً
الهيا. وسمّي كلام الله"
(التفهيمات الالهية ص ۵۸۱)

نت کے ہیں، جنھیں محمد صلعم جانتے تھے
اور اسی زبان میں سوچتے تھے۔ ان کی تعلیم
کے لئے غیب سے معانی (ان کے قلب میں)
پیدا ہوتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ
خدا کی قربت حاصل کرنے کے لئے اس
کے ذریعے سے وہ لوگوں کی ہدایت کر سکیں
اس طرح یہ (یعنی رسولؐ کے الفاظ اور
وحی کردہ معانی) مل کر کلام الہٰی بن گئے
اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہؐ انسانوں
کی بھلائی کا ارادہ کرتے تھے۔ یہ خواہش
تھی جو لفظوں کو جمع کرکے ایک نظم و ترتیب
دیتی۔ پھر وہ اسے موجودہ نظم قرآنی
کے ساتھ منظم کرتے اور خدائی جبروت
کے مطابق اسے تشکیل دیتے۔ اسی لئے یہ خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ
بن گیا اور کلام اللہ کہلایا۔ (التفہیمات الالہیہ ص ۵۸۱)

باوجود ان تصریحات قرآنی کے کفار مصر تھے کہ قول اللہ کو ہم نہیں جانتے۔ یہ قرآن یا تو قول شیطان ہے، یا خود رسول اللہؐ نے بغیر خدا کی مدد کے انسانوں کی مدد سے تیار کرلیا ہے اور پرانے قصّے کہانیاں بیان کردئے ہیں۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے: یقولون انہ لمجنون ۝ ما انت بنعمۃ ربک بمجنون ۝ (ن والقلم) فذکر فما انت بنعمت ربک بکاھن ولا مجنون ۝[29] ام یقولون شاعر؟ نتربص بہ ریب المنون ۝[30] (الطور) ان ھذا الا اساطیر الاولین ۝ قرآن بار بار بتاتا ہے کہ یہ قول فصل ہے، اور تمہارے اقوال کی طرح ہزل نہیں ہے۔ یہ نور و ہدایت ہے اور پرانے نبیوں کا مصدق ہے۔

نزول قرآن علی لسان عمرؓ: قرآن میں کئی آیتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے حضرت عمرؓ کی زبان سے رسول اللہؐ نے سنیں اور انھیں قرآن میں یہ کہہ کر شامل کر لیا کہ حق بات لسان عمرؓ پر جاری ہو گئی۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جو خدائی باتیں توراۃ و انجیل اور دوسری خدائی تعلیمات میں ہیں اور جو حق باتیں دوسرے انسانوں کی زبانوں پر جاری ہوئی ہیں، خواہ وہ کسی زبان میں اور کسی نظم و ترتیب سے ہوں، معناً خدا کی طرف سے ہیں۔ لفظاً وہ عربی یا عجمی کسی زبان میں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کلام من عند اللہ کو لفظاً خدا کا کلام سمجھنا، ایک قدیم صفت الٰہیہ کو حادث قرار دینا ہے۔ خود امام بخاری کا یہی مسلک تھا کہ الفاظ قرآن حادث ہیں۔ اور شاہ صاحب نے تو صاف صاف بتا دیا کہ معنی کا القا بذریعہ فرشتۂ وحی (رسول کریم) قلب رسولؐ پر ہوتا تھا اسی لئے آپ کو حکم تھا کہ وحی نازل ہوتے ہی زبان کو حرکت نہ دیا کریں، بلکہ جب اس کے معنی قلب میں جمع ہو جائیں تو اپنے الفاظ میں اس کی قرأت کریں (لا تحرك به لسانك لتعجل به ط ان علینا جمعه وقرانه ج فاذا قرانه فاتبع قرانه اس کے بعد ضرورت ہوگی تو ہم اس کی تفصیل بھی بیان کریں گے (ثم ان علینا بیانه) (سورۃ القیامہ)

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ: رسول عربیؐ کی کیفیت وحی خود قرآن میں درج ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ فوراً اس کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپؐ اپنے دل میں جلدی کی وجہ سے اُن معنوں کو الفاظ کا بہترین جامہ نہ پہنا سکتے تھے۔ اس پر خدا نے ہدایت فرمائی کہ زبان سے وحی کو بولنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ ہم ان معنوں کو تمہارے قلب میں جمع بھی کر دیں گے اور بلوا بھی دیں گے۔ اس کے بعد تم اس نظم و

ترتیب کے مطابق جو بذریعہ وحی بتائی جائے اُس کو بولو۔ اس۔کے بعد بھی جو تفصیلات بیان رہ جائیں گی انھیں کھول کر بتانا (بیان کرنا) ہمارے ذمّہ ہے۔ (فاتبع قرآنہ۔ ثم ان علینا بیانہ) کے معنی صاف ہیں کہ جو وحی قلب رسولؐ میں خدا "جمع" کرے گا، اس کے الفاظ رسول اللہ صلعم فرشتہ وحی کے ذریعے سے بنائیں گے، اور جب وہ خداوندی معنی الفاظ کے جامہ میں نہ سمائیں گے تو پھر خدا انھیں دوسرے طریقے سے معناً "بیان" کرے گا۔ ۵

بسر تو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں ٭ لیسکہ حیرانم درون سینہ چوں جا کردہٗ

وجدان والہام و قلب : نفسیات و اخلاقیات کی زبان میں وہ استعداد جس کے ذریعے سے ہم اپنے اعمال و احساسات کے متعلق یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ حق ہیں یا باطل وجدان یا ضمیر کہلاتی ہے۔ عام بول چال میں اسے دل یا قلب کہتے ہیں۔ انگریزی میں کانشنس کا لفظ بولا جاتا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں "قلب" سے یہی قلبی استعداد مراد لی جاتی تھی "نزول وحی علی قلب رسول" کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ "وحی رسول کے وجدان کی آواز ہوتی ہے" تو عام انسان اسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ "رسولی ضمیر" کی آواز میں عام انسانیت کی سعادت و فلاح مضمر ہوتی ہے، رسول کا وجدان، وجدان سلیم و صحیح ہوتا ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اس میں رسول کی خود غرضی کو دخل نہیں ہوتا۔ اُس کی دعوت معروف اور حق کی طرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جس کا قلب یا ضمیر خود غرضی حسد اور جاہ و مال طلبی کے وسوسوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ مُنکر اور باطل یعنی گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی اصول پر بعض صحابہؓ کے ضمیر کی پکار کو آنحضرتؐ نے قرآن میں جگہ دے دی۔ اسی لئے ہم تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کا کوئی حکم منسوخ ہے۔ البتہ ہم یہ مانتے ہیں کہ حالات کے اعتبار سے بعض ذرائع حصول مقصد مؤخر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نسخ نہیں تاخیر ہے۔

حروف مقطعات مبہم نہیں ہیں

حروف مقطعات: یعنی حروف ابجد کے متعلق بھی مفسرین بالرائے کہتے ہیں کہ ان کا مطلب ہم نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ ان کو ایک آیت سمجھتے ہیں یعنی یہ بھی ان احکام الٰہیہ میں سے ہیں جن پہ سمجھ لینے کے بعد عمل ضروری ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے پڑھیئے تو سورۃ العلق ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حروف مقطعات (ابجد) جن سے کلام بنتا ہے قلم کے ذریعے سے اللہ دیتا ہے۔ یعنی یہی حروف و کلمات (نہ کہ سحر و کہانت) ایسے ہیں جو ذریعۂ علم الٰہی ہیں مثلاً ن والقلم، وما یسطرون، کی خدا نے شہادت دی ہے۔ کہ کتاب مبین یا علم مبین کا لانے والا بنعمۃ رب "مجنون" نہیں ہے کہ جنوں کے ذریعے سے سحر و کہانت حاصل کرے۔ اسی طرح (الم: ذالک الکتاب، الم ر تلک آیات) میں "ذلک" اور "تلک" کے اشارے ان ہی حروف مقطعات کی طرف ہیں کہ یہی (ھدی للمتقین) ہیں، اور یہی (آیات کتاب مبین) ہیں۔ اور جو لوگ اشتقاق کبیر سے واقف ہیں ان پہ عیاں ہے کہ عبرانی، سریانی اور عربی میں مختلف حروف ابجد کے بھی معنی ہیں۔ مثلاً یاسین اور حاہم کے معنی ہیں اے انسان۔ "با" کے معنی ہیں بیت یا گھر۔ جیم کے معنی ہیں جمل یا اونٹ وغیرہ۔ بہر حال حروف مقطعات مبہم المعنی نہیں ہیں جیسا کہ ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت کی ہے کہ (قال المتشابہات، فیما بلغنا، المر و المص و المر و الر۔ اتقان سیوطی: نوع محکمات و متشابہات)

قرآن کی کوئی آیت مشتبہ المراد نہیں

آیات محکمات و آیات متشابہات: باوجودیکہ ایک معمولی صرفی بھی جانتا ہے کہ شبہ کو تفاعل، افتعال اور تفعیل کے ابواب میں منتقل کرکے قرآن نے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں شبہ کے معنی بدلے ہوئے ہیں لیکن تفسیر بالرائے کرنے والے تشابہ، اشتباہ، اور تشبیہ تینوں کے معنی باب افتعال سے "مشتبہ المراد" بتاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ وہ نہیں جانتے ایک باب تفاعل اور دوسرا تفعل (تشابہ و تشبہ) بھی ہے۔

قرآن میں کوئی آیت مشتبہ المراد یا غیر واضح نہیں ہے (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا)۔ خود قرآن کہتا ہے (کتاب اُحکمت آیاتہ) یعنی یہ ایسا قانون ہے جس کی مختلف دفعات محکم و مضبوط ہیں۔ پورے قرآن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی آیت کے بعد فرمایا کہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر (11/1) یعنی ان ہی محکم آیتوں کی پھر تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تعلیم نور ہو (جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء) اس میں شک شبہ یا ظلمت کہاں داخل ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترتیب نزول سے قرآن نہ پڑھنے کی وجہ سے یہ اندھیر ہوا کہ قرآن کی آیتوں کو مشتبہ المراد سمجھ لیا گیا۔ پہلے سورۃ النساء پڑھ لی جاتی تو آل عمران کی آیت 3 (ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واُخر متشابہات) میں نہ تو متشابہ کو محکم کا ضد سمجھا جاتا اور نہ (فی قلوبھم زیغ) کے متعلق یہ شبہ ہوتا کہ یہ منافق مسلمان ہیں۔

ہر قرآن کا پڑھنے والا جانتا ہے کہ کل قرآن اور اس کی آیات متشابہ ہیں یعنی شبہ ہیں ڈالنے والی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ (اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۔الزمر ۳۹/۲۴) اور مثانی ہیں یعنی بار بار دہرائی گئی ہیں۔ یعنی قرآنی تعلیمات کی آیات نہ صرف قرآن کی ایک دوسری آیتوں سے ملتی جلتی ہیں بلکہ توراۃ و انجیل وغیرہ سے بھی متشابہ ہیں اور ان کتابوں میں بھی بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نصرانیوں کے دلوں میں "زیغ" ہے، وہ ان آیتوں کے پیچھے تو دوڑتے ہیں جو ان کی کتابوں (توراۃ وغیرہ) میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن کی محکم (فیصلہ کن اور بنیادی) تعلیمات کو بھول جاتے ہیں: مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کلمۃ اللہ تھے (القاھا الی مریم) یہ انجیل میں بھی ہے۔ نصاریٰ اس کو تو مان لیتے ہیں اس لئے کہ یہ متشابہ آیت ہے۔ مگر قرآن جو سورۂ آل عمران کے شروع ہی میں کہتا ہے کہ اللہ حی و قیوم ہے۔ مسیح کو اللہ نہ مانو۔ اس لئے کہ اللہ کو موت نہیں آسکتی۔ وہ احد و صمد ہے حی لایموت ہے تو اس محکم آیت کو یہ نصارے نہیں مانتے۔ یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ سورۂ آل عمران کا روئے سخن نصارائے نجران کی طرف ہے۔ اور اُن ہی نصرانیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم میں" الراسخون فی العلم" بھی ہیں جو متشابہ آیات قرآن و انجیل کی تاویل جانتے ہیں۔

بہر حال اگر آل عمران سے پہلے سورہ نساء پڑھ لی جاتی تو واضح ہو جاتا کہ الراسخون فی العلم کے بعد وقف کی بحث غیر ضروری ہے۔ اس سورہ میں صاف صاف (الراسخون فی العلم) سے (منھم) یعنی اہل کتاب مراد ہیں۔ اس لئے کہ اس جملہ کے ساتھ ساتھ (مومنون) کا لفظ مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور سورۂ آل عمران کی طرح اس کا روئے سخن بھی اہل کتاب کی طرف ہے۔ آیات یہ ہیں: وقولھم انا قتلنا مسیح عیسی بن مریم رسول اللہ ج وما قتلوہ وما صلبوہ لاکن شبہ لھم، و اِنّ

الذین اختلفو فیہ لفی شک منہ ط ما لہم بہ من علم الا اتباع الظن ۚ وما قتلوہ یقیناً .... اسی سلسلے میں یہود سے قرآن نے کہا تم میں جو راسخون فی العلم ہیں (اور مسلمان) وہ قرآن کو مانتے ہیں اور ان متشابہ آیتوں کو بھی مانتے ہیں جو توراۃ میں ہیں (لٰکن الراسخون فی العلم منہم والمؤمنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک ..... النساء ۱۶۲) یعنی اہل کتاب کے راسخون فی العلم اور ہم مومنون کو توراۃ اور قرآن پر کوئی شبہ نہیں ہے غرضکہ متشابہات کے معنی ہیں وہ مفصل آیتیں جو محکمات کی تشریح کے طور پر قرآن میں تو ہیں ہی، وہ کتب اولین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں شبہ کی گنجائش نہیں، اسی کے آگے یہ بتایا گیا ہے کہ (انما المسیح بن مریم رسول اللہ وکلمتہ، القاھا الی مریم وروح منہ فآمنوا باللہ ورسلہٖ (صیغہ جمع) ولا تقولوا ثلاثہ)۔ یہی بات سات آٹھ سال پہلے ہجرت حبشہ کے وقت سورہ مریم میں بھی کہی جا چکی

اہل کتاب کی برائی اور تعریف:

سورۃ النساء کے بعد سورۃ آل عمران نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں یہود کی تعریف اور برائی دونوں کی گئی ہے۔ مثلاً پہلے فرمایا کہ ان کا ایک گروہ قرآن کو حق جانتے ہوئے بھی نہیں مانتا (یا اھل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل) اور مومنوں پر جو قرآن نازل ہوا ہے اس کے متعلق وہ گروہ کہتا ہے کہ صبح کو مانو اور شام تک انکار کردو (آمنوا وجہ النہار واکفروا آخرہ) پھر ان کی تعریف میں فرمایا کہ اہل کتاب کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو امانتدار ہے (ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک) اس کے علاوہ فرمایا کہ یہود میں بھی چند مومن ہیں۔ لیکن اگر سب مومن ہو جاتے تو ان کے لئے اچھا تھا:۔ (ولو آمن اھل الکتاب لکان خیراً لھم منھم المؤمنون واکثرھم الفاسقون ۰ آل عمران رکوع ۱۲) اور فرمایا

لیسوا سواءً من اھل الکتاب امۃٌ قائمۃٌ یتلون اٰیات اللہ آناء اللیل وھم یسجدون ۔۔۔۔۔۔۔ اولئک من الصالحین ○ (آل عمران ع ۱۲)

(نوٹ) محکمات ومتشابہات کے سلسلے میں ایک اسکول امام نووی شارح صحیح مسلم کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ امر خدا سے بہت بعید ہے، کہ وہ اپنی مخلوقات سے ایسے الفاظ میں کلام کرے کہ وہ اسے کسی طرح نہ سمجھ سکیں"۔

لیکن انھوں نے بھی یہ دھوکا کھایا ہے کہ "متشابہ (بقول قتادہ وعکرمہ) ضد یا نقیض ہے محکم کی"۔ اگر ترتیب نزول سے پڑھتے تو معلوم ہوجاتا کہ متشابہ کا تعلق اہل کتاب کی کتابوں سے اور ان ہی کے "راسخون فی العلم" سے ہے۔ مومن کے لئے کسی آیت کے معنی مبہم نہیں حتی کہ اہل کتاب کے راسخون فی العلم بھی انھیں اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور انھیں سمجھتے ہیں۔

اہل کتاب، اہل ذکر اور اہل عقل: اسلام یعنی خدا پرستی دین فطرت ہے (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا) اور حضرت آدمؑ یعنی نوع انسانی کی ابتدا سے، ہر قوم میں فطری طور پر خدا کی طرف سے یہ دین جاری ہے۔ شیطان اس دین سے منحرف کرتا رہتا ہے، حتی کہ بچوں کے والدین ہی شیطانی گرگے بن کر انھیں فطری دین سے ہٹاکر یہودیت ونصرانیت کی فرقہ بندیوں میں پھنسانے لگتے ہیں (یھودانہٗ وینصرانہٗ) لیکن اسلام کل دنیا کے اہل کتاب، اہل ذکر اور اہل عقل کو برابر کا درجہ دیتا ہے اور عقل ودانش کو مومن کی گمشدہ چیز بتاتا ہے کہ اُسے جہاں ملے وہ اپنی سمجھ کر اس پر قبضہ کرلے (الحکمۃ ضالۃ المؤمن) اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ترقی کے دور میں (باوجود بنو امیہ کی عربیت کے) مسلمانوں نے دین فطرت پر نظر رکھی، اور ہر قوم وملک کے اولوالالباب اور اہل ذکر سے روحانی اور مادی علوم سیکھے اور سکھائے۔ البتہ دورِ انحطاط کی تنگ نظری نے اُنہیں کوتہ اندیش وخود پرست بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جملہ اہل کتاب سے نفرت کرنے لگے اور بھول گئے کہ قرآن باربار کہہ چکا ہے کہ دنیا کے ہر اہل ذکر اور اہل عقل سے دوستانہ بڑھاؤ:-

فاسألوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ○ (النحل ۴۳)

قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں

ناسخ منسوخ: اسی طرح قرآن میں نسخ وتبدیل آیات کا جو ذکر ہے وہ قرآنی آیات کا نسخ نہیں، بلکہ یہود کی ان خود ساختہ آیتوں (احکام) کی تبدیلی کا ہے جو یا تو حماقت سے یہود وغیرہ نے اپنے لئے اصر و اغلال بنا لئے تھے جیسے کہ اونٹ کا گوشت نہ کھانا یا سبت کے دن شکار نہ کرنا۔ یا تالمود (نہ کہ توراۃ) کی شہادت دیتے تھے کہ سود لینا جائز ہے۔ حالانکہ سود سے بدتر غلامی کوئی نہیں۔ (کل الطعام کان حِلاًّ لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیلُ علیٰ نفسہ من قبل ان تنزّل التوراۃ)۔ اسی لئے قرآن نے کہا کہ یہ باتیں خود ساختہ ہیں توراۃ میں نہیں ہیں (قل فأتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین۔ آل عمران۔ رکوع ۱۰) خدا نے سود حرام کیا تھا لیکن یہودی لیتے تھے اسی وجہ سے ان پر طیبات حرام کردی گئی تھیں (فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبٰتٍ اُحلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرًا۔ واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ) واکلھم اموال الناس بالباطل .... النساء رکوع ۲۲) ان آیات کے پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل آیات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی :—

(۱) یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب (الرعد ۳۹)

(۲) واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ .... (النحل ۱۰۳)

(۳) ما ننسخ من آیۃ اوننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (البقرہ ۹۹)

رسول عربیؐ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا

در دل ہر امتی کز حق مزہ ست　　روئے و آواز پیمبر معجزہ ست (رومی)

آیات اللہ (معجزات) : آیت کے معنی ہیں نشان، دلیل اور دفعات علم و قانون۔ قرآن کا ہر فقرہ بھی ان ہی معنوں میں آیت کہا جاتا ہے کہ یا تو وہ خدا کے موجود ہونے کی دلیلیں اور نشانات ہیں، یا اس کے احکام کی قانونی دفعات ہیں، یا اس کے بتائے ہوئے علم کے جملے ہیں۔

آیات بینات ان روشن دلیلوں یا نشانوں کو کہتے ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ باتیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ سورۃ العلق میں اسی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے وجود کی سب سے بڑی بیّن اور روشن دلیل (آیت) یہ ہے کہ وہ خالق ہے۔ بالفاظ دیگر غیر اللہ میں یہ قدرت نہیں کہ وہ ایک ذرّہ بھی خلق کر سکے یعنی اللہ کے سوا سب خلق کرنے سے عاجز ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے مجازی معنی "معجزہ" یعنی عاجز کرنے والی چیز کے ہو گئے۔

وفی الارض اٰیاتٌ للموقنین ط
وفی انفسکم افلا تبصرون ۝
وفی السماء رزقکم وما توعدون ۝
فورب السماوات والارض انہ
لحقٌ مثل ما تنطقون ۝ (الذاریات ۲۰-۲۳)

آنکھ والوں کے لئے کل دنیا آیات (معجزاتِ الٰہیہ) سے بھری پڑی ہے، اور اگر تمہارے پاس آنکھیں ہیں تو خود تمہارے اندر آیات (اللہ کے موجود ہونے کے نشان) موجود ہیں۔ اور کیا یہ آیت (محیر العقول نشان) نہیں کہ آسمان سے تمہیں رزق (بذریعہ بارش) ملتا ہے اور دوسری چیزیں بھی ملتی ہیں۔ ان ہی آسمانوں اور زمینوں کے مالک کی قسم یہ قرآن بالکل حق کہتا ہے اور تمہاری زبان میں کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔

معجزات رسولؐ عربی : عام طور پر دنیا میں یہ قاعدہ تھا اور اب بھی ہے کہ جب کوئی ایلچی (رسول) کسی کے پاس جاتا ہے تو اس کو وہ نشان (یا آیت) دکھاتا ہے جو بھیجنے والے نے دیا ہو۔ اُسے دیکھ کر رسول یا ایلچی کے متعلق یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ جو پیغام وہ لایا ہے وہ سچّا ہے۔

کفار قریش نے رسول اللہؐ سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر خدا نے آپ کو ایلچی بنا کر بھیجا ہے تو پہلے تو یہ ثابت کیجئے کہ خدا ہے۔ اس کے بعد بھیجنے والے کا کوئی نشان (آیت) دکھائیے کہ واقعی آپ کو اس نے بھیجا ہے۔

مسئلہ وجود باری کے جواب میں آنحضرتؐ نے سیکڑوں ثبوت (آیات) دئے، جو مکی قرآن کی اکثر سورتوں میں تفصیل سے درج ہیں سورہ بقرہ میں بھی آیات کا ذکر ہے مگر وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے اور مکہ ہی میں ذکر ہوا۔ لیکن کفار نے انہیں نہ مانا۔

جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق تھا۔ جس میں آنحضرتؐ سے نشان (CREDENTIALS) مانگا گیا تھا، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایسے نشانات دیکھ لینے کے بعد بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم مان لوگے کہ خدا ہے، اور وہ اپنے رسول بھیجا کرتا ہے۔ تم تو خدا کے وجود کا نشان ہی مانگتے ہو۔ بنو اسرائیل نے تو یہ کہا تھا کہ خدا ہی کو دکھلا دو (نری اللہ جہرۃً) ۱۷

بہر حال جب تم باوجود خدا کی نشانیوں کی کثرت کے اُس کو ماننے سے انکار کرتے ہو، تو یہ ثابت کرنا بھی غیر ضروری ہے کہ میں اس کا رسول ہوں۔ اگر تمھیں اس بات میں شبہ ہے کہ خدا اپنے رسول بھیجا کرتا ہے تو جن قوموں میں رسول آچکے ہیں اُن سے پوچھ لو (فاسئلو اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون (الانبیاء) میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں (ما انا بدع من الرسل ۰ قد خلت من قبلہ الرسل)۔ مگر کفار یہی کہتے رہے کہ جیسے معجزے اگلوں کو دئے گئے تھے ویسے دکھاؤ۔ فلیاتنا بایاتہ کما ارسل الاولون (الانبیاء)

پھر کفار مکہ نے کہا کہ آپؐ بار بار یہ کہتے ہیں کہ جو قوم رسولوں کی ہدایت

کو نہیں مانتی اُس پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ آپ عاد، ثمود، قوم لوط و قوم فرعون کے قصے سُناتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ سچ ہے کہ آپ اللہ کے ایلچی ہیں، تو ہم تو نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ آپؐ کو۔ ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے اللہ سے کہہ کر عذاب نازل کرا دیجئے۔ تب شاید ہم مان لیں کہ اللہ ہے۔ (طسمم الشعرا ع۶)

اس پر آپؐ نے فرمایا کہ عذاب آنے کے بعد تمھارا ایمان لانا بیکار ہوگا۔ وہ عذاب نہ رکے گا اور تمھاری توبہ بیکار ہو گی۔ دوسرے یہ کہ میں خود تم میں موجود ہوں، اس لئے بھی خدا عذاب نہ نازل کرے گا۔

یہ سُن کر کفار نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک بے آب و گیاہ ہے۔ یہاں اپنے خدا سے کہہ کر ایک دریا جاری کرا دو۔ اور اگر تمہارا خدا ہمارے لئے یہ نہیں کر سکتا تو تم خود اپنا گھر سونے سے بھر لو۔ اس پر آنحضرتؐ کے دل میں یہ تمنّا ہوئی کہ کاش خدا کوئی نشانِ رحمت (معجزۂ رحمت) نازل کر دیتا کہ یہ لوگ اسے مان لیتے۔ لیکن اللہ نے بذریعہ وحی کہا کہ انسان کو عقل و شعور اسی لئے دیا گیا ہے، کہ وہ کائنات و خلق اللہ میں تدبّر و تفکر کرے۔ اُسے جانور نہیں بنایا گیا کہ مجبوراً اپنی فطرت کے مطابق عمل کرے۔ جب ان لوگوں میں ہٹ دھرمی کی یہ حد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے طغیان کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور وجود باری کو نہیں مانتے اور ہزاروں آیات الٰہیہ پر سے اندھوں کی طرح گزر جاتے ہیں گویا کہ ان کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں، تو اس کے سوا ان کا علاج نہیں کہ یا تو انھیں بجبر مومن بنایا جائے یا دولت کتابیہ قائم کر کے اُن کی بُت پرستی اور تجارت کو ختم کر دیا جائے۔

رسول اللہؐ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا: رہا یہ معاملہ کہ تم خود چاہتے ہو کہ کوئی آیت (نشان یا معجزہ) دیا جائے تو یاد رکھو کہ اگر تم زمین میں سُرنگ لگا کر گھس جاؤ گے یا آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جاؤ گے۔ تب بھی تمھیں معجزہ نہ دیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ اگر آسمان سے لکھی ہوئی کتاب بھی اُترے تو کافر نہ مانیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو نظر بندی ہے۔

(لو انزلنا علیک کتابا فی قرطاس فقال الذین کفروا ان ھٰذا الا سحر مبین۔ و ان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بایہ .... الانعام)۔ یاد رکھئے کہ آنحضرت کو یقین کامل تھا کہ خدا چاہے تو محیّر العقول چیزیں (معجزات) دکھا کر یہ ثابت کرسکتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ لہٰذا جب کفار کہتے تھے کہ تم پر معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا (و قالوا لولا نزّل علیہ اٰیۃ مّن رّبّہٖ الانعام ع ۴) تو اسی آیت میں آپ جواب دیتے تھے کہ اللہ آیت (محیّر العقول معجزہ) نازل کرنے پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو کرسکتا ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھتے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتا ذرا آنکھ کھول کے دیکھو کہ جانور اور پرندے سب تمھاری ہی مانند ہیں جو ایک قانون (کتاب) میں بندھے ہوئے ہیں۔ (قل ان اللہ قادر علی ان ینزل اٰیۃ ولاکن اکثرھم لا یعلمون ۰ وما من دابۃ ..... یحشرون ۰ (الانعام ع ۴) جب تمھیں عقل و شعور دیا جاچکا تو پھر کیوں نہیں دیکھتے کہ خدا خالق ہے۔ تم اور تمھارے معبود خالق نہیں ہیں۔ تم خلق کرنے سے عاجز ہو۔ یہی آیت (معجزہ) کافی ہے۔ کسی دوسرے معجزے کی ضرورت نہیں)۔

مکی سورتوں کی یہ آخری دلیل ہے۔ جس میں اللہ نے صاف صاف انکار کردیا ہے کہ کوئی معجزہ اس طرح کا نہ دیا جائے گا جسے دیکھ کر یہ کافر اللہ کے ہونے کا یقین کریں اور آپؐ کو اللہ کا ایلچی مانیں۔

روایات میں معجزاتِ نبویؐ: باوجودیکہ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ رسول اللہؐ کو کوئی معجزہ نہ دیا جائے گا۔ لیکن راویوں نے بہت سے معجزے تصنیف کرلئے اور ہر مولود کی کتاب کے آخر میں یہ معجزے ملتے ہیں۔ یہ روایتیں نومسلموں نے گڑھی ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ بعض علماء نے قرآن سے معجزات ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ مثلاً (۱) شق القمر، (۲) فصاحت قرآن اور (۳) رویائے اسراء

اُن کی نظر میں رسول اللہؐ کے معجزے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، آیت (معجزہ) اللہ کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایسا نشان (آیت) ہوتا ہے جس کے کرنے سے لوگ عاجز ہوتے ہیں اور مان لیتے ہیں کہ ایسی معجز چیزیں کرنے والا سوائے اللہ کے غیر اللہ نہیں ہو سکتا۔

(۱) **شق القمر:** بقول شاہ ولی اللہؒ آیتٌ من آیات اللہ ہے۔ یعنی اللہ کے وجود کا نشان ہے کہ وہ قمر کو بھی شق کرسکتا ہے۔ (یہاں ہم اس حدیث عائشہؓ سے بحث نہیں کرنا چاہتے جس میں اس روایت کی تغلیط کی گئی ہے)

اس کے علاوہ ان "علماء" کو صرف شق القمر ہی کیوں معجزہ معلوم ہوا قرآن میں شروع سے آخر تک خدا کی خالقیت کے جو نشانات (معجزے) درج ہیں انھیں کیوں نہ معجزہ کہا۔ خدا نے عاقرہ کو لڑکا دیا۔ باکرہ سے حضرت عیسٰے کو پیدا کیا (سورہ مریم) گناہگاروں پر پتھر برسائے (امطرنا علیھم حجارۃ من سجیل الحجر) جانوروں میں دودھ پیدا کیا (ولکم فی الانعام لعبرۃ۔ المؤمنون) مردہ زمین کو بارش سے زندہ کیا (احیاء الارض بعد موتھا۔ یاسین) آسمانوں کو بغیر ستون کے کھڑا کیا (رفع السماوات بغیر عمد۔ الرعد) اور سب سے بڑا معجزہ تو یہ بتایا کہ وہ خالق سماوات والارض ہے جیسا کہ پہلی ہی سورۃ میں بتا دیا۔ الذی خلق۔ یا وَمن اٰیاتہ خلق السماوات و الارض......... ویعلمون الذین یجادلون فی اٰیاتنا ما لھم من محیص ۝۳۵ (الشوریٰ)۔ یقولون لولا انزل علیہ اٰیۃٌ من اٰیات ربہ۔ وان فی اختلاف اللیل والنھار وما خلق اللہ فی السماوات والارض لاٰیاتٌ لقوم یتقون ۝ (سورۃ یونس)

(۲) **اعجاز قرآن:** بہر حال ایسے علماء بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن میں رسول اللہؐ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں۔ لیکن وہ بھی قرآن کو معجز مانتے ہیں اور اسے رسول اللہؐ کا معجزہ کہتے ہیں۔ اس میں شک

نہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن رسول اللہؐ کی تصنیف ہے، تو ہم اسے رسول اللہؐ کا معجزہ کہہ سکتے ہیں اور اس کی فصاحت و بلاغت وجہ اعجاز مانی جاسکتی ہے لیکن یہ خدا کا معجزہ یا آیت اللہ نہیں کہی جاسکتی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر زبان اپنے زمانے کے افکار و واقعات کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتی یعنی ناقص ہوتی ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی یا تنزل کرتا ہے، زبان بھی ترقی یا تنزل پذیر ہوتی رہتی ہے۔ زندہ قوموں کی زبانیں ترقی کرتی رہتی ہیں مگر کسی زبان کو کامل نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ترقی کناں مانی جاسکتی ہے۔ اور اگر امام ولی اللہ محدث دہلوی کی تفسیر کو مانا جائے تو قرآن کے الفاظ نہیں، بلکہ معنی خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ اسی لئے الفاظ کلام عربی بھی دوسری زبانوں کی طرح حادث و ناقص ہیں۔ البتہ معنی قدیم ہیں اور معنوی اعتبار سے یقیناً "کفار قریش کے لئے" قرآن حکیم معجزہ تھا۔

معجزہ کے یہ معنی نہیں کہ وہ اگر چاہتے تو قرآن کے مانند عبارت نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ (لو نشاء لقلنا مثل ھذا...... قرآن)۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے اور قرآن کو اساطیر الاولین اور سحر کہتے تھے۔ (ھذا اساطیر الاولین ان ھو الا سحر یوثر)۔ اور رسول اللہؐ کو چیلنج دیتے تھے کہ شعر کہو تو ہم قائل ہو جائیں۔ جس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ مَا علمناہُ الشعر وما ینبغی لہ۔ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین ہ (یاسین) اور اسی کے بعد فرمایا کہ اے رسول تو ان کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہو (فلا یحزنک قولھم)

تب اس تحدی کے کیا معنی ہیں جو قرآن میں بار بار کی گئی ہے کہ اگر تم کو ان باتوں پر شک ہے جو اللہ نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کی ہیں تو تم ان باتوں کی مانند ایک ہی عبارت بنا لاؤ۔ اور اس بات کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کہ جو کچھ تم نے تصنیف کیا ہے وہ قرآنی تعلیم

کی مانند ہے اپنے گواہ بھی لیتے آؤ۔ لیکن یقیناً تم ایسا نہیں کر سکتے:

(ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء کم ان کنتم صادقین)...... (البقرہ ۲۳)

ترتیب نزول کے اعتبار سے "تحدی" کے سلسلے میں مندرجہ بالا آیت، آخری آیت ہے۔ سب سے پہلی آیت سورہ طور کی چونتیسویں آیت ہے (فلیأتوا بحدیث مثله ان کانوا صادقین ٥ الطور ۳۴) اب آپ صرف اس آیت کو نہ پڑھیں بلکہ سورۂ طور کے آخری رکوع کو جس میں یہ آیت ہے پورا پڑھ جائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اگر یہ تحدی ہے تو صرف قرآن کے لئے نہیں بلکہ توراۃ کے لئے بھی ہے۔ اور اس میں بھی وہی دلیل دی گئی ہے جو "رسول اللہ" ہونے کے ثبوت میں کہا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ہر قوم میں رسول آئے ہیں اُسی طرح میں بھی ایک رسول ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم اہل ذکر سے پوچھ سکتے ہو۔

اسی طرح کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ وہ رسول اللہ؂ کو کاہن، مجنون اور شاعر کہتے تھے، قرآن نے کہا کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ پیغام من عند اللہ نہیں ہے بلکہ محمد (صلعم) کی تصنیف ہے۔ تم اس کو نہیں مانتے۔ اگر یہ کلام کاہنوں اور شاعروں کا سا کلام ہے اور تم سچے ہو، تو اس کلام کی مانند ایک بات ہی بنا لاؤ۔ عدم سے وجود میں لانے والے تم نہیں ہو، خدا ہے۔ اُسی نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔ (دیکھئے سورہ طور ۲۹-۳۷)

اس کے بعد اسی سورہ کی ۴۸ ویں اور ۴۹ ویں آیتوں میں صاف صاف کہ دیا کہ

۴۸۔ فلما جاء ھم الحق من عندنا قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ اولم یکفروا بما اوتی موسیٰ من قبل؟	۴۸۔ جب ان کافروں کے پاس ہماری طرف سے حق (قرآن) آیا تو کہنے لگے کہ ویسا کلام کیوں نہیں آیا جیسا کہ موسےٰ لائے تھے؟

قالوا سحران تظاھرا ۞ وقالوا انا بکل کافرون ہ

کیا موسیٰ کے کلام کا پہلے ان لوگوں نے انکار نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰؑ و محمدؐ یا توراۃ و قرآن) ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ہم سب کا انکار کرتے ہیں۔

۴۹۔ قل فأتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدیٰ منھما اتبعہ ان کنتم صادقین ہ

۴۹۔ (بہرحال اے رسول) تو ان سے کہہ دے کہ اگر تم لوگ سچے ہو اور توراۃ و قرآن سے زیادہ بہتر ہدایت دینے والی کتاب لا سکتے ہو تو لاؤ، میں تیار ہوں کہ اس کی پیروی کروں۔

پھر اس کے بعد جو آیت ہے وہ بھی سورۃ العلق کی تائید میں ہے کہ عَلَّمَ الانسان ما لم یعلم ہ یعنی علم خدا دیتا ہے۔ اور شیطانی علم گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس آیت سے "وحی من عند اللہ" اور "اتباع اھواء" کا تضاد بھی ظاہر ہے۔ یعنی جو بات مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں کہی گئی ہے۔ اور جو بات سورۃ العلق اور سورۃ الناس میں بتائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ خواہشات نفسانی سے جو بات کہی جائے وہ القائے شیطانی ہے اور جو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے وہ منجانب اللہ ہے۔ بہرحال اس آیت پر غور کیجئے:۔

۵۰۔ فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون اھواءھم، ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ (الطور)

۵۰۔ اے رسول اگر وہ توراۃ و قرآن سے بہتر ہدایت کنندہ کتاب نہ لا سکیں، تو جان لے کہ وہ اھواء (شیطان یا نفس امارہ) کی پیروی میں ہیں (صرف شعر و کہانت ہی جانتے ہیں) اور ان سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر خواہشات (شیطانی) کی پیروی کریں (الطور)

سورۂ طور کی اُنچاسویں آیت میں "منہما" کا اشارہ توراۃ و قرآن کی طرف ہے۔ کافروں کے لئے ان کتابوں کو معجزہ کہا گیا ہے۔ اس آیت کو اُن آیتوں کی روشنی میں پڑھئے جن میں کتب الہیہ کی تصدیق کی گئی ہے اور انھیں آیات اللہ میں شمار کیا ہے: مثلاً

وقالوا لولا یأتینا بآیۃٍ من ربّہٖ — اور انھوں نے کہا کہ یہ اپنے رب کی کوئی نشانی اپنے ساتھ نہیں لایا۔

الصحف الاولیٰ۔ — (اس کا جواب یہ ہے کہ) کیا اگلی کتابوں کی بینات (یعنی آیات و دلائل) اُن لوگوں کو بار بار نہیں پہنچائی گئیں (کہ توراۃ وغیرہ بھی یہی کہتی ہیں کہ خدا موجود ہے)

اسی سورہ میں دیکھئے کہ خدا نے آپ ؐ کو منذر بتایا ہے، ایسا منذر جیسا کہ دوسری قوموں میں ہوتا ہے جو اُنھیں ہدایت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف قرآن توراۃ کی سی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ رسول قرآن بھی ویسے ہی رسول ہیں جیسے کہ رسول توراۃ (حضرت موسیٰؑ) تھے۔

ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ: انما انت منذر ولکل قومٍ ھاد (سورہ ۱۳-۷) (سورہ ۱۳-۲۶) — کافر کہتے ہیں کہ اس پر (رسولؐ عربی پر) کوئی نشانی کیوں اُتری؟ (ان سے کہہ دو کہ) میں بھی اُسی طرح کا ایک خبردار کرنے والا ہوں جس طرح ہر قوم میں ہادی آتے رہے ہیں (میں کوئی انوکھا ایلچی (بدعاً من الرسل) نہیں ہوں)

کل کتب الہیّہ کافروں کے لئے معجز ہیں:

مندرجہ بالا آیات سے ثابت ہے کہ چیلنج کی صورت میں استہزاء اور تکذیب رسول کی ابتدا مشرکین کی طرف سے ہوئی تھی۔ اگر اس دَور کی سیرتِ نبوی پہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ رسول کریم صلعم نے باوجود انتہائی متانت و مُروّت کے جو غضب آلود اور کرخت انداز جواب

اختیار کیا ہے وہ محض خدا کے حکم سے کیا ہے۔ ورنہ جن حالات میں آپؐ تھے
اور جیسے قسی القلب لوگوں میں آپ گھرے ہوئے تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی
معمولی انسان ایسے جواب دیتا اور اس کی جان کی خیر رہتی۔ یہ کام تو آنحضرتؐ
نے سر بکف ہوکر، اور محض اللہ کے بھروسے پہ کیا تھا۔ کہ کہیں انھیں رد در رد
جہنم کی آگ سے ڈرایا۔ کہیں انتہائی حریص، طماع، زر پرست، عتل اور
زنیم کہا۔ ظاہر ہے کہ عرب کے لئے اس سے زیادہ رسوا کن باتیں نہیں کہی
جاسکتیں۔ لہذا جب کفار نے کہا کہ قرآن بھی شیطانی کلام ہے، تو آنحضرتؐ
نے (وحی الٰہی سے) فرمایا کہ اگر واقعی یہ شیطانی کلام ہے تو تم اس کی
مانند یا توراۃ کی مانند کوئی کلام بنا لاؤ، اور اگر ممکن ہو تو اس سے بہتر بنا لاؤ
میں تیار ہوں کہ اس کی پیروی کروں۔ دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا نرم کلامی
اور شیریں سخنی ہو سکتی ہے۔ کیا یہ چیلنج یا تحدی ہے؟ یا اس کی ابتدا
آنحضرتؐ کی طرف سے ہوئی ہے؟ خدا کا یا رسولؐ کا یہ کام نہیں کہ وہ خدا کے
ادنیٰ بندوں کے مقابلے میں لام باندھے اور جینوتی بازی کرے۔ یہ شیوہ تو کفار
کا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مفاخرت و منافرت کیا کرتے تھے اور کسی
کو پنچ مقرر کرکے اپنے اپنے کارنامے بیان کیا کرتے تھے۔ اور جو شکست
کھاتا تھا اُسے مقررہ مال ہارنا پڑتا تھا اور بسا اوقات جلاوطن ہونا پڑتا تھا۔

قرآن کی بہت سی باتوں پر ترتیب نزول کے نہ ہونے اور عربوں کی
تاریخ کو ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور
چونکہ قرآن نے ان دشمنان دین کے نام بتا کر زندہ جاوید نہیں قرار دئے
اس لئے آپ نہیں جانتے کہ وہ کون سے اشرار تھے جنھوں نے تکذیب کی
تھی اور وہ کون تھے جو آنحضرتؐ کو بار بار چیلنج کرتے تھے۔ لیکن تاریخ شاہد
ہے کہ بنو امیہ ان میں سب سے آگے تھے۔ ان ہی کے آباؤ اجداد نے رسول اللہؐ
کے آباؤ اجداد ہاشمیہ کو بار بار چیلنج کیا تھا مثلاً :-

مبارزت

(۱) اُمیہ بن عبد شمس بن عبد الدار نے اپنے چچا ہاشم بن عبد مناف کو منافرت کے لئے چیلنج دیا تب بنو خزاعہ کا ایک کاہن پنچ (شاھد) بنا۔ اور اُس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ کیا۔ اُمیہ سو اونٹ ہارا اور دس سال کے لئے جلا وطن کیا گیا۔ (۲) حرب بن امیہ نے عبد المطلب بن ہاشم کو للکارا۔ انھوں نے پہلے تو شاہ حبشہ کو پنچ (شاھد) بنانا چاہا لیکن اس کے انکار پر ایک قرشی حَکم بنا۔ آخر حرب ہارا اور عبد المطلب کی دوستی چھوڑ کر عبد اللہ بن جدعان کا مصاحب بن گیا۔ (یاد رہے کہ یہ وہی حرب ہے جو رسول اللہؐ کے مقابلے میں برابر فوج کی سرداری کرتا رہا۔ اور اس کے بعد اس کے بیٹے ابو سفیانؓ بن حرب نے یہ عہدہ سنبھالا تھا)

غالباً اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ چیلنج کدھر سے تھا اور اس کے جواب میں رسول اللہؐ نے کتنی نرمی برتی تھی کہ ان کافروں سے بار بار کہا کہ

۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ

بناؤ۔ میں اس پر چلے

قل ارأیتم ما تدعون من دون الله اروني ماذا خلقوا من الارض ام لهم شرك في السماوات ائتوني بكتاب من قبل هذا او اثرة من علم ان كنتم صادقين ٥ (سورہ : الاحقاف ۴)	نہ تو تم نے اپنے دیوتاؤں کو دیکھا ہے نہ ایک چیز بھی ایسی دکھا سکتے ہو جو انہوں نے پیدا کی ہو۔ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا علمی یادداشت لاؤ کہ (یہ دیوتا خدا کی خالقیت میں شریک ہیں)۔

کفار کے چیلنج کے جواب میں بار بار قرآن نے یہی کہا کہ یہ ذکر (تعلیم) نہ صرف مجھ پر ایمان لانے والوں کے لئے ہے، بلکہ گذشتہ قوموں میں بھی خدا

کے رسول یہی تعلیم حق لاتے رہے ہیں کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کی بندگی کرو۔" لیکن اگر تم اس کو نہیں مانتے تو اپنی بُرہان لاؤ کہ اس "حق" ("کتاب"۔ "علم"۔ "اثرۃ من علم") اور اس نصیحت (ذکر) کے علاوہ کسی رسول اللہ کی تعلیم یہ نہیں تھی، بلکہ طاغوت (نفس) پرستی تھی۔

اَمِ اتخذوا من دونہ اٰلِھَۃً ط قل ھاتوا برھانکم ج ھٰذا ذکر من مّعی وذکر مَن قبلی ط بل اکثرھم لا یعلمون الحقّ لا فھم معرضون ۝ وَمَا ارسلنا من قبلک من رسولٍ الّا نوحی الیہ انّہٗ لَا اِلٰہَ اِلّا انا فاعبدون ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۳-۲۵)

کفار کیوں مثل کلام رحمانی نہ بنا سکے؟

باوجودیکہ کفار کہتے تھے کہ (لونشاء لقلنا مثل ھٰذا) یعنی اگر ہم چاہیں تو اس کی مانند کلام کہہ سکتے ہیں۔ تو آخر کیا وجہ تھی کہ نہ کہا؟

بات یہ ہے کہ اگر کہتے تو یہی کہتے کہ خدا موجود ہے۔ وہی خالق ہے دوسرا خالق نہیں۔ وہی علم دیتا ہے شیطان علیم نہیں۔ کل قوموں میں اللہ کا راستہ بتانے والے اور طاغوت سے اجتناب کرنے والے آتے رہے ہیں۔ نیکی کرنا اچھا ہے۔ ظلم کرنا بُرا ہے۔ خدا یوم الدین میں جزائے اعمال دے گا۔ اور مرنے کے بعد زندگی یقینی ہے۔

چونکہ وہ ان سب باتوں کے منکر تھے، لہٰذا اگر قرآن یا توراۃ کی مانند کلام تصنیف کرتے تو مسلمان ہو جاتے۔ اس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

اور اگر اس تعلیم کی مانند تصنیف نہیں کرتے تھے (جیسا کہ نہیں کیا باوجودیکہ ان ہی کے شہداء پر اس کا فیصلہ چھوڑا گیا تھا) تو ہارتے تھے غرض ہر طرح سے شکست ہوتی تھی۔ ورنہ عربی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ اب تک ہم کلام جاہلیہ سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور اصول معانی وبیان

میں بھی قرآن نے کلام جاہلیہ کی پیروی کی۔ اور قرآن اُس عربی زبان میں نازل ہوا جو کفار قریش بولتے اور سمجھتے تھے اور جو آنحضرتؐ نے بچپن سے سیکھی تھی۔

اسی طرح مصری نبی مصری، چینی نبی چینی، روسی نبی روسی، انڈونیشیا کے نبی جاوی، ایران کے نبی اوستا یا ایرانی میں خدائی کلام لوگوں کو اپنی اپنی زبانوں میں سناتے تھے۔ ان میں بہت سی کتابیں یعنی تعلیمیں ضائع ہو گئیں۔ خود توراۃ کے اُن نوشتوں کا پتہ نہیں جو حضرت موسیٰ نے طور سینا پر الواح میں مصری زبان و رسم الخط میں لکھے تھے۔ نہ اس کے قدیم ترجمے، جو تابوت سکینہ میں محفوظ رکھے جاتے تھے باقی ہیں۔ البتہ توراۃ کے ترجمے یا ترجموں کے ترجمے موجود ہیں۔ اور یہی ترجمے رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی تھے۔ ان ہی کو قرآن نے کتاب اللہ مانا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ شیطانی کلام نہیں ہے۔ اور جو وحی بالمعنی حضرت موسیٰ پر ہوتی تھی وہ ہی ترجموں میں لوگوں نے بیان کی ہے۔ اسی لئے ہم اسے احادیث نبوی (یعنی وحی غیر متلو) کا درجہ دیتے ہیں۔ اور کلام من عند اللہ مانتے ہیں۔ قرآن کے متعلق ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ (بخلاف توراۃ وغیرہ کے) ان ہی لفظوں میں موجود ہے جو رسول اللہؐ نے لوگوں کو سنائے تھے۔

(۴) **اسراء نہ کہ معراج:** قرآنی تعلیمات کو نہ سمجھنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ واقعہ اسراء کو جو ایک رؤیا (خواب) تھا، معراج یعنی آسمان تک بلند ہونا قرار دے دیا۔ ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کریں گے اس لئے کہ قرآن نے خود اس کی تردید کر دی ہے، کہ یہ معراج نہیں بلکہ رؤیا تھا۔ یہ رؤیا جن احوال میں آپ نے دیکھا تھا وہ سیرت نبوی کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس کا مقصد بنو اسرائیل سے دوستی کرنا تھا۔

اسی طرح کا ایک رؤیا حدیبیہ جانے سے پہلے بھی آپ نے دیکھا تھا، اور وہ بھی ایک روحانی حقیقت تھی نہ کہ جسمانی عروج الی السماء۔

آیات (معجزات) امور اسبابیہ ہوتے ہیں

گزشتہ نبیوں کے متعلق بھی جن آیات الہٰیہ کا ذکر ہے وہ سب ان قوانین الہٰیہ کی پابندی میں ظہور میں آئے تھے جو خدا نے بنائے ہیں۔ اس لئے معجزات ماننے والوں کا یہ کہنا کہ وہ خارق العادہ (یعنی فطرت الہیہ کو پھاڑ ڈالنے والے) ہوتے ہیں غلط ہے۔ خود خدا نے جو قوانین بنائے ہیں وہ نہ خرق ہو سکتے ہیں نہ اُن میں تغیّر و تبدّل ہو سکتا ہے۔ یہی قرآنی تعلیم ہے (لن تجد لسنّۃ اللہ تحویلاً ولن تجد لسنّۃ اللہ تبدیلا) یعنی جو باتیں عام انسان کو خارق العادۃ معلوم ہوتی ہیں وہ خارق العادۃ نہیں ہوتیں بلکہ قوانین الہیہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ دریا کا پھٹنا، کھٹمل پسّو وغیرہ کا یک بیک کثرت سے پیدا ہو جانا۔ مُردے کا جی اُٹھنا، بغیر آگ کے کسی چیز کا جل اُٹھنا، مٹی سے پودا اور پودے سے رنگ برنگ کے پھولوں کا ظاہر ہونا، چڑیوں کا اُڑنا، بھاری بھاری جہازوں کا سمندر میں نہ ڈوبنا یہ سب قوانین الہٰیہ کے مطابق اور مسبب بہ اسباب ہیں اسی لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی فرماتے ہیں :-

"فاللہ سبحانہ احدی مجرد من الصفات فی مرتبۃ واحدۃ ولحاظ واحد۔ ومقرون بالصفات فی مرتبۃ اُخری ولحاظ اٰخر۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس ان مواطن نفس الامر متفاوتۃ منھا مواطن الاسباب، وفیہ العلۃ والمعلول فقط والسبب والمسبب فحسب ومن المتحقق عندنا انہ لم یترک الاسباب قط ولن یترک۔ ولن تجد لسنّۃ اللہ تبدیلا۔ وانما المعجزات والکرامات امور اسبابیہ سوغ علیھا قتباینت سائر الاسبابیات"

(التفہیمات الالٰہیہ ص ۵۳)

معجزات بزدلی کی وجہ سے مانگے گئے: جب کسی قوم میں پستی آجاتی ہے اور قوتِ عمل کم ہو جاتی ہے، تو وہ حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح اپنے ہادی سے کہتی ہے کہ جاؤ تم اور تمہارا رب جنگ کر کے فتح کر دو. یہ کام (یعنی جنگ) ہمارے بس کا نہیں ہے۔ (فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ۵ المائدہ ع ۴)

ظاہر ہے کہ آسمان تک عروج کرانے کی بجائے یہ آسان تھا کہ غارِ ثور میں تین دن چھپے رہنے کی جگہ آنحضرت صلعم کو ہجرت کے وقت چشم زدن میں مدینہ پہنچا دیا ہوتا اور مکڑی کو جالا تننے اور فاختہ کو انڈے دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بلکہ اس سے آسان معجزہ یہ ہوتا کہ منکرین مکہ کی قلب ماہیت ہو جاتی اور رسول اللہ صلعم کو اس عالم کون و فساد میں جلا وطنی کی صعوبت نہ اُٹھانا پڑتی۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى: قرآنی تعلیم ہے کہ سعی و عمل ہی سے انسان اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔

وہ دوسری بے عمل اور توہم پرست اقوام کی طرح یہ نہیں چاہتا کہ خدا ان کے بدلے کام کرے اور وہ بے مشقت معجزات و کرامات کے سہارے زندہ رہیں۔

قرآن ایک تعلیم انقلاب ہے۔ وہ صاف صاف معجزات کا منکر ہے اور ایسا انقلاب لانا چاہتا ہے جس میں ہر فرد کی اور مجموعی حیثیت سے کل دنیا کی قوتِ عمل اور خودی بیدار ہو جائے۔ وہ پہلے اونٹ کا پاؤں مضبوط باندھیں۔ اس کے بعد اللہ پر توکل کریں۔ وہ پہلے خود اعتمادی کے ساتھ عمل کریں اور پھر اتمام اللہ پر چھوڑ دیں یعنی آمنوا و عملوا الصالحات کے ساتھ ساتھ حق پرستی اور صبر کو اپنا مسلک بنائیں اور موت کو شکست دے کر زندۂ جاوید بن جائیں، اس وقت اللہ اُن کے ساتھ ہوگا۔ (استعینوا بالصبر والصلاۃ۔ ان اللہ مع الصابرین) یعنی اگر تم پہلے سے خود اعتمادی اور صبر کی صفات اپنے اندر نہ پیدا کرو گے تو خدا کبھی تمہارا ساتھ نہ دے گا، نہ جنود اللہ آسمان

سے اُتر کر سکینہ اور اطمینان قلب بخشیں گے۔

غرضکہ قرآن اور دوسری ربّانی تعلیمات صراط مستقیم کی طرف لے جاتی ہیں اور اس پیغامِ خداوندی کو انسانوں یا جنوں تک پہنچانے والے خدا کے ایلچی یا رسول کہلاتے ہیں۔ یہ خدائی پیغام بالمعنی خدا سے حاصل کر کے مختلف قوموں کی زبانوں کے ذریعے سے ان تک پہنچاتے ہیں۔ یہ رسول اپنی تعلیم کی اُجرت نہیں لیتے۔ ان کی زبان صاف سمجھ میں آنے والی (عربی مبین) ہوتی ہے۔

شیطانی تعلیمات وہ ہیں جو انسان کو گمراہی میں ڈالتی ہیں اور شرک و کفر و ظلم میں مبتلا کر کے انسان کو پستی اور ذلت کا راستہ دکھاتی ہیں۔ شعرائے عرب کا تفاخر نسب اور قصاص یا خمریات وغیرہ اسی میں داخل ہیں۔ کاہنوں کی غیب گوئیاں اور ساحروں کے سحر بھی شیطانی ہیں۔ یہ لوگ اُجرت لے کر یا معاوضہ کی امید میں اپنا کلام سناتے ہیں۔ ان کی زبان ذو جہتین ہوتی ہے۔ اور ان کا مقصد کچھ نہیں ہوتا (فی کل واد یہیمون)

کلام اللہ اور مسئلہ خلق قرآن: مامون الرشید کے زمانے میں جب خالص عربی افتخار میں آرین فلسفہ اور تصوّف نے رخنہ ڈالا۔ اور عربی و عجمی افکار کی آویزش رنگ لائی تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ وحی یا الہام کیا چیز ہے۔ یونان کی دیویاں جوذی اُس کے تخت کے آگے ناچتی ہیں، ما ہرانی کا سروش فرشتہ اور ہند کے دیوتاؤں کی آواز جو بے لفظ و صوت ہوتی ہے اور دیو بانی کہلاتی ہے، ان سب نے مل کر یہ سوال اُبھارا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ یعنی قرآن یونانی لوگاس یا کلام یا عقل اوّل کی طرح خود جزو خدا ہے، یا بقول یونانی انجیل کے خود ہی خدا ہے (شروع میں خدا تھا، خدا کے ساتھ کلام تھا، کلام (لوگاس) ہی خدا تھا" انجیل متی) یعنی اگر قرآن مخلوق ہے تو حادث ہونا لازمی ہے۔ اور اگر قدیم ہے تو یہ جزو واجب الوجود ہے یعنی صفات باری میں سے کلام بھی ہے۔

محدثین کلام الٰہی کو قدیم مانتے تھے (ان کے لیڈر امام احمد بن حنبل تھے) اور جو اسے نہ مانے اُسے کافر کہتے تھے۔ امام بخاریؒ نے یہ راہ نکالی تھی کہ قرآن کا تلفظ حادث ہے (یعنی اس کے معانی قدیم ہیں) یہ بھی علمائے لسان عربی کو گراں گزرتا تھا۔ حتےٰ کہ امام احمد کے شاگرد ذہلی اپنے شاگرد امام بخاریؒ سے اسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عربی زبان کو کسی عجمی زبان کے برابر تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ ہر ملک و قوم میں اسی قوم کی زبان میں ہادی آتے رہے ہیں۔ مقصد معانی ہدایت الی اللہ ہے خواہ وہ کسی زبان میں دی جائے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر زبان حادث ہے۔ ورنہ جتنی زبانوں میں خدا کا کلام نازل ہو چکا ہے، سب کو قدیم ماننا پڑے گا اور جب یہ کہا جائے گا کہ قدیم خالدی زبان اب باقی نہیں ہے نہ صحف ابراہیم باقی ہیں، تو ماننا پڑے گا کہ خالدی زبان حادث تھی۔ اسی طرح صحف موسیٰ قدیم مصری زبان میں تھے اور ہیروغلیفی رسم خط میں تھے۔ عرصہ ہوا نہ زبان رہی نہ رسم خط نہ مصری زبان کی توراۃ یعنی صحف ابراہیمؑ و موسےٰؑ نے اس لئے حدوث کا منہ دیکھا کہ وہ زبانیں ہی زندہ نہ رہیں۔ خود قرآنی عربی اتنی بعید الفہم ہو گئی ہے کہ ہر سال نئی نئی تفسیریں لکھی جا رہی ہیں۔ اسی لئے ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ کتب الٰہیہ کے معانی تو قدیم ہیں اور باقی ہیں، لیکن الفاظ حادث اور فانی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس کسی زبان میں خدا کا کلام یا قانون یا علم بیان کیا جائے وہ خدائی زبان ہے۔ بالفاظ دیگر "وہ خدا کی زبان" نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے بتایا ہے کہ کلام من عند اللہ وراے حجاب سے نازل ہوتا ہے۔ یہی مسلک امام ولی اللہ دہلوی کا ہے۔

شیطان اور انبیاء

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (حم السجدہ ع ۵)

اِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کی نص صریح میں گنجائش تاویل نہیں ہے۔ رسول اللہ اور جملہ انبیاء انسان تھے، فرشتہ نہیں تھے اور قرآن کے ذریعے سے کافروں کو بار بار سمجھا چکے تھے کہ نبی انسان ہوتے ہیں فرشتہ نہیں ہوتے۔

قرآن نے شرک کو مٹانے اور انسان سی ناچیز "مخلوق" کو "خالق" کی کارفرمائیوں میں شریک کرنے کے تصور کو سورۂ علق ہی میں ختم کر دیا تھا۔ انسان نہ تو خود بخود وجود میں آسکتا ہے نہ اسے سوائے خالق کائنات کی مدد کے حقیقی علم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسےٰ تک جتنے نبیوں کا ذکر ہے سب میں یہی کہا گیا ہے کہ وہ بشر ہیں۔ وہ مجبور ہیں۔ انھیں جو کچھ اختیار ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کیا ہوا ہے اگر وہ اپنے ہوائے نفس سے یعنی شیطان کے القاء اور اس کے بہکانے سے کچھ کریں گے تو اس کے جواب دہ ہوں گے۔ یعنی انھیں جو اختیار بخشا گیا ہے اس کے غلط استعمال پر سزا پائیں گے۔ غرضکہ ہر انسان سے خطا و نسیان کا سرزد ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

قرآن نے شیطان یا اہرمن کا تصور وہی دیا ہے جو دنیا والے اور عرب جانتے تھے۔ وسواس الخناس، ہوائے نفس، یا القائے شیطان اور خطوات الشیطان کے لفظ بھی اسی برائی کی راہ دکھانے والے نفس (امارہ بالسوء) کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن شاہد ہے کہ حضرت آدم کو ابلیس نے دھوکا دیا جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے۔ (فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْھَا فَاَخْرَجَھُمَا مِمَّا

کانا فیہ ۔ بقرہ : ۳۵) (فوسوس لھما الشیطان لیبدی ما ادری ئ
عنھما من سواتھما ۔ بقرہ ۲۰) اس پر حضرت آدم وحوا نے توبہ کی اور اعتراف
گناہ کیا ۔ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من
الخاسرین (بقرہ ۲۳) سے یہ بات ثابت ہے ۔

نصاریٰ تو یہ مانتے ہیں کہ حضرت آدم نے شیطان کے بہکانے سے جو گناہ کیا
تھا وہ بغیر کفارۂ گناہ کے معاف نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اوپر کی آیت سے ثابت ہے
کہ سچے دل سے گناہ کا اعتراف اور پھر اس کا اعادہ نہ کرنے کا عہد (توبہ)
اللہ کے نزدیک کافی ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمؑ کے گناہ کے لئے خدا اپنا
"بیٹا" بھیجے اور وہ سولی پر چڑھایا جائے ۔ قرآن کے نزدیک یہ ظلم ہے کہ
جرم آدمؑ کریں اور سزا مسیحؑ کو ملے ۔ اسی لئے قرآن نے صاف کہا ہے کہ جو
جرم کرے وہی سزا پائے ۔ اور اگر جس کا جرم کیا ہے اُس سے معافی طلب
کرے تو اُسے اختیار ہے کہ معاف کر دے ۔ لہٰذا وہ جرائم (گناہ) جو اللہ سے
تعلق رکھتے ہیں ، توبہ کرنے پر معاف کئے جا سکتے ہیں ۔ البتہ وہ جرائم جو انسانوں
سے متعلق ہیں ، وہ اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتے جب تک کہ
جس کا جرم کیا ہے وہ معاف نہ کرے ۔

بہر حال شیطان نے حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک جتنے انبیاء گزرے
ہیں سب کو بہکانے کی کوشش کی ۔ اسی کو القائے شیطانی کہتے ہیں ۔ اسی
واسطے رسول اللہؐ کو حکم تھا کہ قرآن پڑھتے وقت خدا کی پناہ مانگ لیا کرو
کہ شیطان قریب نہ آسکے ۔ پھر یہ بھی قرآن نے بتایا کہ ان مومنوں پر جو اپنے
رب پر بھروسہ رکھتے ہیں شیطان کا بس نہیں چل سکتا (فاذا قرأت
القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم ۝ انہ لیس
لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلیٰ ربھم یتوکلون ۝ (النحل ۹۸-۹۹)
ان عبادی لیس لک علیھم سلطان وکفی بربک وکیلا ۝ (بنی اسرائیل ۶۵)

سنہ ۵ نبوی یعنی ابتدائے رسالت میں ایک مرتبہ شیطان نے آنحضرتؐ پر بھی حملہ کیا تھا اور چاہا تھا کہ آپؐ خدا کے ساتھ قریش کی دیویوں اور لات منات اور عزّیٰ کو بھی شفیع مان لیں۔ آپؐ نے تلقائے نفس سے دو جملے پڑھ دیئے (تلك الغرانیق العلی ۔ ان شفاعتھن لترجی) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ہجرت حبشہ کر گئے تھے وہ واپس آنے لگے ۔ لیکن ان لوگوں کو واپسی پر معلوم ہوا کہ فرشتۂ وحی نے آنحضرتؐ کو فوراً ہی بتا دیا تھا کہ یہ جملے اس نے نہیں سکھائے بلکہ خطوات الشیطان یا وسوسۂ شیطانی سے تھے ۔ آنحضرتؐ نے اس کا اعلان فوراً کر دیا کہ شفاعت کے معاملہ میں کسی غیر اللہ سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور جتنے غیر اللہ معبود ہیں وہ حصب جہنم ہیں۔ پھر مکہ فتح ہو چکا اور اوپر والے جملوں کے واقعے کو سولہ سترہ سال گزر چکے ۔ تو آپؐ سنہ ۹ھ میں مکہ تشریف لائے ۔ لوگوں کو وہ بات اب تک یاد تھی تو خدا نے وحی نازل فرمائی ۔ اور اسی سلسلے میں خدا نے فرمایا کہ شیطان نے پہلے بھی اس طرح کی شرارتیں کی ہیں :-

۵۱ ۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ ۔ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ واللہ علیم حکیم ۝	۵۱ ۔ اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے جب تمنائیں کی ہوں تو شیطان نے اُن آرزوؤں میں القا نہ کیا ہو لیکن اللہ القائے شیطان کو منسوخ کر دیتا ہے اور پھر اپنے

احکام کو مضبوط کر دیتا ہے اس لئے کہ وہی علیم و حکیم ہے (شیطان نہیں ہے)

۵۲ ۔ لیجعل ما یلقی الشیطان فتنۃ للذین فی قلوبھم مرض والقاسیۃ قلوبھم (المائدہ)	۵۲ ۔ پھر جن لوگوں کے دلوں میں مرض اور قساوت ہوتی ان کے لئے رسولؐ کی یہ آرزوئیں جو القائے شیطانی

ہونے کے بعد منسوخ کر دی گئی ہیں، فتنہ بن جاتی ہیں۔

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی سورۃ الحدید نازل ہوئی
تھی۔ مندرجہ بالا آیات سے پہلے قرآن میں آچکا تھا کہ

وان کادوا لیفتنونک عن الذی ۔ تھا کہ شیاطین قریش تجھے اس
اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہٗ ۔ وحی سے پھیر دیتے جو خدا نے کی تھی اور
فاذا لاتخذوک خلیلاً ہ ۔ تو دوسری باتیں خدا کی طرف منسوب
کردیتا اگر تو ایسا کرتا تو خدا اپنی دوستی سے تجھے خارج کردیتا۔

اور پھر ان آیات کے بعد سخت وعید ہے کہ اے رسول اگر تو نے خطوات الشیطان
پر عمل کیا ہوتا تو ہم زندگی میں اور مرنے کے بعد دونوں حالتوں میں تجھ پر دگنا عذاب کرتے۔

بہر حال یہ آنحضرتؐ کی علوئے مرتبت کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے القائے شیطانی
کے بعد بھی اُن باتوں پر عمل نہ کیا اور خدا کے کرم سے محفوظ رہے اور صاف اعلان کردیا کہ
یہ میری کمزوری تھی۔ آخر میں بھی "بشر" ہوں۔ جب ابوالانبیاء شر شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے
تو کسی اور انسان کا خطا و نسیان میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ البتہ جو انسان خطا
کرے اور توبہ کرلے وہی مقبول بندہ ہے۔ اسی واسطے قرآن نے بہت سے نبیوں کی زبانی اس
بات کا اعتراف کرایا ہے کہ انہوں نے اقرار گناہ کیا اور کہا (انی کنت من الظالمین) یا
(ربنا ظلمنا انفسنا) خود حضرت موسیٰ جیسے اولی العزم نبی کے حال میں ہے "نسیان" حکم الٰہی بھی
شیطان کے القاء سے ہوتا ہے (فانی نسیت الحوت ط وما انسانیہ الا الشیطان
ان اذکرہٗ ۔ سورۃ الکہف ۶۲)

بہر حال ترتیب نزول قرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو القائے شیطان کا مسئلہ
صاف ہو جاتا ہے۔ اور نہ تو انبیاء کو اتنا بلند کرتا ہے کہ وہ دیوتا بن جائیں نہ عام
انسانوں کو خطا کاری کے عوض جہنمی قرار دیتا ہے بلکہ رحمت الٰہی کا دروازہ
خطا کاروں کے لئے زیادہ رحمت و رافت کے ساتھ کھلتا ہے بشرطیکہ وہ
اجتناب گناہان کا صدق دل سے عہد کریں۔

توراۃ وانجیل وغیرہ محرف نہیں، یہ کلام من عنداللہ ہیں

القرآن مصدّقٌ لما معھم۔ قرآن توراۃ وانجیل وغیرہ کی تصدیق کرتا ہے۔
بعض "یہود تحریف لفظی کرکے اصل معنی کو بدلنا چاہتے ہیں"

توراۃ اور دوسری ربانی تعلیمات کو قرآن "الکتاب" کہتا ہے اور بار بار اُن کی تصدیق کرتا ہے۔ مصدقا لما بین یدیہ، وما انزل من قبلک سے یہی مراد ہے

مثلاً:- ۱- یا اھل الکتاب لستم علی شیٔ حتی تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم

اے اہل کتاب اگر تم توراۃ وانجیل اور قرآن کو نہ قائم کرو (یا ان پر عمل نہ کرو) تو تم بالکل بے اصولے ہو جاؤ گے۔

۲- قل فأتوا بالتوراۃ واتلوھا ان کنتم صادقین ٥

اے رسولؐ ان یہودیوں سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو تورات لائیں اور اُسے پڑھ کے سنائیں۔

۳- انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی ونور یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء۔ (المائدہ ع ۷)

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت و نور ہے۔ اس کے مطابق وہ بنی یہود کے لئے فیصلے کیا کرتے تھے جو حکم ماننے والے (مسلم) تھے۔ اور حکم کرتے تھے ربانی (درویش) اور علماء (احبار) اس لئے کہ وہ محافظ بنائے گئے تھے کتاب اللہ (توراۃ) پر۔ اور وہ اس کی نگہبانی پر مقرر تھے۔ (المائدہ ع ۷)

۴- ولیحکم اھل الانجیل بما

اور عیسائیوں کو چاہیئے کہ اس قانون

انزل اللہ فیہ، ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون، (المائدہ ع ۷)

کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اُتارا ہے اور جو اللہ کے قانون (توراۃ) کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ نافرمان ہے۔ (المائدہ ع ۷)

۵۔ ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم منھم اُمۃ مقتصدۃ وکثیر منھم ساء مایعملون ۰ (المائدہ ع ۹)

۵۔ اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو خدا کے یہاں سے نازل ہوا ہے (یعنی قرآن) کو قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے (یعنی خدا کے انعامات پاتے)۔ ان میں کچھ لوگ سیدھی راہ پر ہیں، اور بہت سے بدراہ ہیں (المائدہ ع ۹)

۶۔ یاایھا الذین اوتوا الکتاب اٰمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم ۰

۶۔ اے اہل کتاب تم اس قرآن پر ایمان لاؤ جو تمہاری تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے۔

اس سلسلے میں حدیث بخاریؒ ہے کہ:۔

عن عبد اللہؓ بن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلعم بلغوا عنی ولو اٰیۃ۔ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج۔ ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ فی النار۔ (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ میری طرف پہنچاؤ خواہ وہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔ اور بنو اسرائیل سے ذکر کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ اپنی جگہ آگ میں بنائے گا۔ (بخاری)

ترجمہ حضرت عبد اللہؓ بن سلام کے سلسلے میں علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابن سلام بنو اسرائیل کے بہت بڑے عالم (حبر) تھے۔ آپ مسلمان ہوگئے اور آنحضرتؐ سے توراۃ پڑھنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا

کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو، اور دوسری رات توراۃ پڑھا کرو۔ (اقرأ هذه ليلة وهذه الليلة)

ابن حزم نے لکھا ہے کہ ہم توراۃ و انجیل کا انکار نہیں کرتے بلکہ جو ان کا انکار کرے اس کو کافر سمجھتے ہیں (نحن لم انكرهما قط، بل نكفر من انكرهما) ہم کہتے ہیں کہ توراۃ موسیٰ، زبور داؤد، انجیل عیسےٰ، صحف ابراہیم و موسیٰ، اور وہ کتابیں جن کا نام نہیں بتایا گیا نہ نبیوں کے نام بتائے گئے (کتباً لم يسم لنا على انبياء لم يسموا لنا) یہ سب حق ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کفار بنو اسرائیل نے تورات و زبور کو بدل دیا ہے اور کمی زیادتی کردی ہے ان میں بعض باتیں خدا نے بطور حجّت الزامی کے باقی رکھی ہیں (وابقى الله بعضها حجة كما شاء) اسی طرح کفار نصاریٰ نے بھی کیا ہے۔ باقی کتابوں کو اللہ نے اٹھالیا ہے۔ (ابن حزم۔ ملل والنحل۔ ج۔۱۔ص ۱۵۷-۱۵۸)

یہود تحریف لفظی کرتے ہیں: ابن حزم کا آخر قول ان نصوص کے قطعی خلاف ہے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اُن کی غلطی کی بنیاد اُن آیتوں پر ہے جن میں تحریف و تبدیل کلمات کا ذکر ہے: مثلاً اخراج یہود اور قتل بنو قریظہ کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ "یہودیوں کا ایک فریق (وان منهم لفريقا يلوٗن السنتهم۔۔۔۔ آل عمران ع ۸) ایسا ہے جو توراۃ کو زبان اٹھلاکر پڑھتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ یہ الکتاب (توراۃ) ہے، لیکن درحقیقت وہ توراۃ نہیں ہوتی۔ وہ جھوٹ کہتے ہیں کہ یہ توراۃ ہے"۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہود بعض ایسی عبارتیں پڑھتے تھے جو توراۃ کی نہیں ہوتی تھیں۔ جملہ یہود کے لئے یہ نہیں کہا گیا۔ صرف ایک فریق کے لئے کہا گیا۔ اسی سورہ میں آگے کہا گیا ہے کہ سب یہودی برابر نہیں (ليسوا سواءً ط) ان یہودیوں میں ایک فرقہ ایسا ہے جو راہ راست پر ہے۔ وہ لوگ راتوں کو توراۃ پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں (من اهل الكتاب امة قائمة

یتلون اٰیاتِ اللّٰہ اٰناء اللیل وھم یسجدون ۝) اس کے آگے اور بھی تعریفِ یہود ہے۔

ترتیب، نزول کے اعتبار سے سورۂ نساء میں اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا کہ (من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وّراعنا لیّاً بالسنتھم وطعناً فی الدین) یعنی یہود نے کلمات کو اٹھلا کر بولنا اپنا وطیرہ بنالیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ کلمات توراۃ کے نہیں ہوتے۔ عام بول چال میں وہ اس طرح زبان اٹھلا کر تحریف کلمات کرتے ہیں کہ سمعنا واطعنا کو سمعنا وعصینا کہتے ہیں اور انظرنا کہنے کی جگہ راعنا کہتے ہیں۔ تاکہ بظاہر معلوم ہو کہ ٹھیک لفظ بول رہے ہیں۔ مگر وہ زبان اٹھلانے کی وجہ سے بُرے لفظ بن جاتے ہیں وہ بعض الفاظ توراۃ کو بھی اٹھلا کر اس لئے بولتے ہیں کہ ان کا مفہوم بدل جائے۔ (فارقلیط)

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس سے بہت پہلے جب آنحضرت ؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے اور یہود و مسلم معاہدے کی رو سے یہ دونوں ایک "امت واحدہ" بن گئے تھے اور ان دونوں کے سرپنچ (حَکَم) آنحضرت ؐ قرار پائے تھے۔ اس وقت سے منافقین یہود کی یہ حالت تھی کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب تنہا ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ توراۃ میں جو تصدیقِ نبوی ؐ ہے اس کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سلسلے میں قرآن نے بتایا ہے کہ یہ یہود تو وہ ہیں کہ ان میں ایک فریق ایسا تھا جو کلام اللہ (توراۃ) کو سنتا تھا اور اسے پوری طرح سمجھ لینے کے بعد بھی جان بوجھ کر اس میں تحریف کرتا تھا۔ یعنی بولتے وقت اُن لفظوں کو زبان سے اوّل بدل کر بولتا تھا تاکہ جو حکم ہے وہ نہ ماننے بلکہ محرف لفظ کی پابندی کرے۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ ایک گروہ ایسا تھا کہ عام بول چال ہی میں نہیں اپنی کتاب کے لفظوں میں بولتے

وقت ہیر پھیر کرتا تھا۔ (دیکھئے افتطمعون ان یومنوالکم وقد کان فریق یسمعون کلام اللہ ثم یحرّفونہٗ من بعد ما عقلوہ، وھم یعلمون۝ البقرۃ ع ۹) اسی کے آگے ہے کہ ان میں بعض اُمّی ہیں یعنی "نادان" ہیں وہ "الکتاب" (توراۃ کے قانون) سے واقف نہیں۔ وہ صرف اپنی خودساختہ خواہشات میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہم میں مبتلا ہیں" (ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الّا امانیّ وان ھم الّا یظنّون) اسی کے بعد فرمایا کہ" ان یہودیوں پر افسوس ہے جو اپنی طرف بعض چیزیں الکتاب کے نام سے (تالمود۔ یا مشنع۔ یا تاریخ قدیم) لکھتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ پھر اس فریب سے تھوڑا سا روپیہ کماتے ہیں۔ اس کتابت اور اس کمائی دونوں پر لعنت ہے" (فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم، ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً ط فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۝ البقرۃ ع ۹) بات یہ ہے کہ یہودی فقیہ اس طرح کے قوانین (کتب) تصنیف کیا کرتے تھے جن کے ذریعے سے امرا کو توراۃ کے احکام سے چھٹکارا مل جائے۔ اور پھر یہ کہتے تھے کہ یہ باتیں توراۃ سے ماخوذ ہیں بلکہ خود کلام اللہ ہیں۔ اس طرح جھوٹے فتووں پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ علمائے سوء ہر زمانے میں یہی کرتے رہے ہیں۔

قرآن عہد نامۂ قدیم کو میثاق بنی اسرائیل کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصلی میثاق یہ تھا کہ سوائے اللہ کے کسی کی بندگی نہ کرو اور احکام عشرہ پر عمل کرو۔ اُسی کو تم نے توڑ دیا (واذا اخذنا میثاق بنی اسرائیل الخ۔ بقرہ ع ۹) پھر جب اس میثاق کی تصدیق کرنے والا قرآن آیا تو تم کہنے لگے کہ جو احکام ہم پر اترے ہیں (یعنی توراۃ اور خود نوشتہ تالمود) کو تو ہم مانیں گے اس کے علاوہ جو کچھ ہے (یعنی قرآن نے توراۃ

کی سخت آیتوں کو بدلا ہے) اُسے ہم نہ مانیں گے (قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ ... بقرہ ع ۱۰) اور ان میں سے ایک فریق نے رسول اللہؐ اور قرآن کو، جو مصدق توراۃ ہیں، ماننے سے انکار کر دیا۔ (ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون ۰ بقرہ۔ ۱۲)۔

بہرحال باوجودیکہ یہودی جانتے تھے کہ آپؐ رسول اللہ ہیں اور توراۃ میں بھی ایک نبی کے آنے کی خبر تھی، لیکن وہ "فارقلیط" کے لفظ کو اُلٹا کر بولتے تھے، یا اُن آیتوں کو چھپاتے تھے جن میں آمد فارقلیط کا ذکر تھا اس لئے قرآن نے کہا کہ (الذین اٰتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون ۰ بقرہ ع ۱۷) آگے قرآن نے کہا کہ (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب، اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون ۔۔۔۔ بقرہ ع ۱۸) یہاں بھی توراۃ کو ہدایت والی الکتاب کہا ہے۔ اور جو لوگ اس کی ہدایت اور اللہ کے رسول کی آمد وغیرہ کی آیتوں کو چھپاتے ہیں اُن پر لعنت بھیجی ہے۔

ان یہودیوں کی حالت یہاں تک خراب ہو گئی ہے کہ میثاق بنی اسرائیل (عہدنامۂ قدیم یا توراۃ) کے برخلاف جبت وطاغوت (بت اور شیطان) کو پوجتے ہیں یعنی شرک بھی کرتے ہیں اور مشرکین کی طرح کہانت وسحر بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ کافروں کو مسلمانوں سے بہتر بتاتے ہیں (الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت ویقولون للذین کفروا ھٰؤلاء اھدیٰ من الذین اٰمنوا سبیلا ۰ النساء ع ۷) اور ان کی دنائت کی انتہا ہو گئی ہے کہ یہ منافقت سے ایمان لاتے ہیں تاکہ

کفار کی جاسوسی کریں۔ اور کلمات کو ان کے اصلی تلفظ سے ادا نہیں کرتے۔ بلکہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے فارقلیط یا ایسے ہی دوسرے الفاظ کو (جن کا اوپر ذکر ہوا) الٹا اُلٹا کر بولتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ہماری مصنوعی کتاب اللہ (تالمود وغیرہ۔ یا محرف الفاظ) کی مانند قرآن میں آیات آئیں تو انھیں تو ہم مان لیں گے، اور اگر ان کے خلاف ہو تو نہ مانیں گے۔ یہ جھوٹے، حرام خور جاسوس ہیں۔ (ومن الذین ھادوا سمّاعون الکذب سمّاعون لقوم آخرین لم یاتوک ۵ یحرّفون الکلم من بعد مواضعہٖ ویقولون ان اوتیتم ھٰذا فخذوہ وان لم تؤتوہ فاحذروا.... (المائدہ ٦)

غرضکہ قرآن سے ثابت ہے کہ توراۃ وانجیل وغیرہ نور و ہدایت ہیں محرف نہیں ہیں۔ یہودیوں کی ایک جماعت حق کو نہیں چھپاتی۔ توراۃ پڑھتی ہے۔ ایک فریق ایسا بھی ہے جو حق کو چھپاتا ہے، اور ایسے لفظ محرّف کرکے بولتا ہے جو توراۃ کے نہیں ہیں نہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ یہ جاسوس اور سود خوروں کی جماعت ہے۔ یعنی اصلی توراۃ وانجیل اچھے یہودیوں اور نصرانیوں کے پاس ہے اور محرّف نہیں ہے۔ ان کتب الٰہیہ میں نہ تو تحریف لفظی ہے نہ معنوی۔ اس لئے کہ یہ تعلیمیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ شیطانی نہیں ہیں۔ البتہ جو لوگ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے منزل توراۃ کے ہے وہ جھوٹے ہیں۔ وہ انھوں نے اپنے تلقائے نفس سے روپیہ کمانے کو لکھا ہے لہٰذا وہ شیطانی ہیں۔

اسلامی احکام کی حکمت

(یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَہ)

ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآنی زبان میں الکتاب کے معنی قانون زندگی یا علم کے ہیں۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قانون یا علم بھی سکھاتا ہے، اور اس قانون کی حکمت یا غایت بھی بتاتا ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر قوم میں ہادی آچکے ہیں اور اسلام یعنی طاعت الٰہی کی تعلیم دے چکے ہیں۔ عربی زبان بولنے والوں کے لئے آسان اور سمجھنے میں آنے والی زبان عربی تھی لہذا ان کے لئے کتاب و حکمت کی تعلیم عربی زبان میں دی گئی (لعلکم تعقلون)۔ یہ عجیب بات ہوتی کہ عربوں کے سامنے فارسی یا لاتینی زبان میں اوستا اور بائبل کی طرح تعلیم دی جاتی اسی واسطے قرآن نے کہا کہ عربوں کے لئے عربی زبان ہی ہوسکتی ہے (أ أعجمیّ وعربی؟)۔ لہذا:۔

۱۔ قرآن کا ترجمہ ہر زبان میں ہونا چاہیئے تاکہ لوگ قوانین الٰہیہ کی حکمت کو سمجھ کر اُس پر عمل کرسکیں۔

۲۔ اگر وہ عربی زبان نہ جانتے ہوں تو وہ اپنی نماز میں بھی اپنی اپنی زبانوں میں پڑھیں، ورنہ قرآن کی حکمت میں تدبّر و تفکّر نہ کرسکیں گے۔ (افلا یتدبرون القرآن؟ افلا یتفکرون؟)

ہم یہاں اس بحث کو نہیں شروع کرنا چاہتے کہ کس طرح بنواُمیہ کے عربی افتخار نے عجمیوں کو اپنی زبان میں قرآن اور اسلام کو سمجھنے سے روکا۔ البتہ یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ آخرکار فارسی زبان اسلامی زبان بن گئی اور

مثنوی رومی کو قسہ۔ آن زبان پہلوی مانا گیا۔ امیر خسروؒ نے فارسی کو عربی سے بہتر کہا خانوادۂ ولی اللہی نے اردو سے ہندی کو بلند کیا۔ اور شاہ فضل الرحمانؒ گنج مرادآبادی نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر ہندوستان میں قرآن نازل ہوتا تو بھاشا میں ہوتا۔ (دیکھئے ترجمۂ سور قرانیہ در بھاشا: از شاہ فضل الرحمانؒ گنج مراد آبادی)

اگر ہم احکام اسلام کی حکمت کو جانے بغیر ان پر عمل کریں تو ایک رسم تو ادا ہو جائے گی لیکن اس کا مقصد یا مفاد حاصل نہ ہوگا۔ عمل سے پہلے مقصد کا متعین کرنا ضروری ہے۔ ورنہ عمل تو ہوگا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسی کو فعل عبث کہتے ہیں۔

سیرت نبویؐ کو ترتیب نزول قرآن کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے ہر عمل کی حکمت و غایت نمایاں ہو جاتی ہے۔ آخرہ و اولی، ہدایت وضلال، حق و باطل، نور و ظلمت، فنا و بقائے دوام، اور جزائے اعمال کی حقیقت سیرت نبویؐ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے کہ جنھیں ہم عبادات کہتے ہیں وہ درحقیقت ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا وجود میں نہیں آسکتا۔ لہذا یہ بحث ہی فضول ہے کہ ایمان کے بغیر عمل یا عمل کے بغیر ایمان کی کیا حیثیت ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اگر ہم احکام اسلام کی تاریخ پر اُن کے نفاذ کی ترتیب کے ساتھ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی حکمت و غایت یہ تھی کہ ایسی انقلابی جماعت بنائی جائے جو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جان و مال سے تیار ہو۔ پھر یہ حزب اللہ ایسی دولت کتابیہ قائم کرے جس میں سب کتابی متحد ہو کر طاغوت پرستی کو ختم کردیں۔ صوم وصلوٰۃ، حج و زکوٰۃ سب اسی مجاہدے اور جہاد فی سبیل اللہ کی منزل کے درمیانی نشانات راہ ہیں اور ایک ہی مقصد و غایت کے لئے بنائے گئے ہیں۔

مثلاً :-

۱۔ صلوٰۃ

قرآن کے مکی دور میں صلوٰۃ کے معنی سلام، خوش اخلاقی، فریضہ انسانی یا دھرم کے ہیں۔ یہ قدیم سامی لفظ یورپ میں بھی سلام، سجدہ اور تعظیمی بوسے کے معنوں میں "صلیوت" ہی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح دین۔ دھرم اور دُنیا سب طریقہ زندگی یا فرض منصبی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ نماز فرض ہونے سے پہلے، یعنی سنہ نبوی تک جب قرآن کا روئے سخن کفار مکہ کی طرف تھا تو اس لفظ سے نماز مراد نہیں تھی۔ ہمارے بعض مترجمین اس لفظ کے معنی ہر جگہ نماز کر دیتے ہیں اور یہ نہیں خیال کرتے کہ مخاطب کون ہے۔ اور ترتیب نزول کے مطابق کس زمانے کی آیت ہے: مثلاً

(۱) الا المصلین ۵ الذین ھم علیٰ صلوٰتھم دائمون ۵ (وہ دین دار جو اپنے فرائض پر قائم ہیں) المعارج

(۲) و ذکر اسم ربہ فصلیٰ ۵ (اور اس نے اپنے رب کو یاد کرنے کے بعد اپنا فرض انجام دیا) الاعلیٰ

(۳) فصل لربك وانحر ۵ (اپنے رب کے بتائے ہوئے فرائض ادا کر اور نحر کر کے بھوکوں کو کھلا) الکوثر

(۴) فویل للمصلین الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون ۵ (ان لوگوں پر خرابی ہو جو اپنے فرض سے بے خبر ہیں) الماعون

(۵) قالوا لم نك من المصلین ۵ ولم نك نطعم المسکین ۵ (مجرم بولے کہ ہم اپنا فرض اطعام مسکین نہ ادا کرتے تھے) المدثر

(۶) فلا صدق ولا صلی ۵ ولکن کذب وتولیٰ ۵ (نہ اس نے تصدیق کی نہ سلام کیا بخلاف اس کے تکذیب کی اور منہ موڑ لیا) القیامہ

(۷) ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلیٰ ۔۔۔۔ او امر بالتقوی ۵ (اس شخص

کی شرارت تو دیکھو کہ جب وہ بندہ (یعنی رسول اللہؐ) اپنے آقا کی خدمت بجالاتا ہے تو وہ منع کرتا ہے..... یا اگر گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے، تو وہ رد کرتا ہے) العلق۔

تبلیغ اسلام کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں صلاۃ جن فحشاء و منکر سے بچاتی تھی وہ کیا تھیں، غلاموں، مقروضوں، عورتوں اور بے کسوں پر جو مظالم ہوتے تھے ان کا شمار فحشاء میں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شرک، افلاس سے زیادہ منکر (گھناؤنی) کیا چیزیں ہوسکتی ہیں۔ العلق سے والمرسلات تک کا وہ زمانہ ہے جس میں دو مرتبہ کفار قریش کے وفود ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روکو ورنہ ہم یا تو اسے قتل کر ڈالیں گے، یا بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں کو دشمن قرار دے دیں گے۔ والضحیٰ، الم نشرح، العلق، الفیل، القدر، قریش، واللیل، والعادیات، زلزال، والعصر، التکاثر، القارعہ، الناس، اذا الشمس، الھمزہ، المعارج، عبس، البلد، والفجر، الاعلیٰ، الکوثر، الماعون، اللھب، الطارق، المزمل، والتین، الانشقاق، الانفطار اور والمرسلات کو پڑھ ڈالئے۔ سب میں صلوٰۃ کا یہی مفہوم ہے کہ اطعام مسکین کرو۔ ظلم سے باز آؤ۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد بھی پناہ نہ ملے گی یعنی دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے اور اکل مال بالباطل کی سزا پاؤ گے۔

مظلوموں کو صلوٰۃ کی یہ تعلیم تھی کہ ارباب من دون اللہ کے خلاف بغاوت کردو، اور صرف اُس رب کے بندے بنو جو تمہارے بھلے ہی کے لئے تم کو علم دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس کے سوا تمہارا کوئی آقا نہیں۔
بہرحال رسول اللہؐ مختلف ادوار تبلیغ اسلام میں مختلف سورتوں کے ذریعے سے مختلف اقوام کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ اور صلات کا مقصد تو ایک ہی رہا لیکن طریقے بدلتے رہے۔

مکہ میں نماز کا طریقہ یہ تھا کہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر آپؐ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ کفار قریش کی طرف سے علانیہ، بالجہر قرآن پڑھنے کی سخت مخالفت تھی، حتیٰ کہ آپؐ نے روئے سخن نصارائے حبشہ کی طرف کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شعب ابی طالب میں جانا پڑا۔ اور جو مسلمان ہجرت کر سکتے تھے وہ حبشہ چلے گئے۔ تین سال تک شعب کی سختیاں جھیلنے کے بعد جب آپ سنہ نبوی میں شعب سے رہا ہوئے تو اسراء کا خواب دیکھا اور اسی زمانے میں جملہ مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ استعانت بالحق کیا کرو۔ اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کیا کرو۔ یہ صلوٰۃ حزب اللہ کی فتحمندی کے لئے خدا سے استعانت کی دُعا تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عمل یہ تھا کہ سب مسلمان مکہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کو اپنا مرکز عمل بنانے کی کوشش میں تھے۔

نماز باجماعت: ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ میں حزب اللہ کا مرکز بنا اور مسلمانوں نے مسجد بنائی اور جماعت کے ساتھ اپنے مقصد یعنی نور کی ظلمت پر فتح کے لئے اللہ سے دُعا (صلوٰۃ) باجماعت شروع کر دی۔ اس کے بعد ایسا زمانہ آیا کہ نمازوں میں دُعائے قنوت بھی پڑھی گئی۔ (اسی لئے حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اسے جزو قرآن سمجھتے ہیں) اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جب انا فتحنا پڑھی گئی۔ غرضکہ نماز کی نوعیت مختلف زمانوں میں مختلف رہی۔ اس لئے اگر صحیح طور پر سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھی جائے تو مختلف احوال میں صلوٰۃ کی مختلف صورتیں ہو جائیں گی۔

غرضکہ صلوٰۃ کے دو بڑے مقصد ہیں:۔

(۱) اللہ کو مان کر اپنی جماعت میں خود اعتمادی پیدا کرنا۔

(۲) دنیا سے خوف وجوع کو ختم کرنے کے لئے خدا سے مدد مانگ کر جہاد کرنا۔

۲۔ صوم : روزہ

جس طرح نماز، انسان میں خود اعتمادی پیدا کرکے حصول مقصد کا ذریعہ بنتی ہے، اسی طرح روزہ بھی انسانیت کو خوف و جوع سے بچاتا ہے، اور دولت کتابیہ کے قیام کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی روزے رکھے جاتے تھے اور اُن کی مختلف غرضیں تھیں۔ مثلاً ہندو اپنے مُردوں کے سوگ میں روزے رکھتے ہیں اور مُردے کو جلانے کے وقت تک کھانا نہیں کھاتے۔ (مُسلمان بھی دفن تک فاقہ کرتے ہیں) اور اس طرح اُن کے لئے اظہار غم کرتے ہیں۔ بابل کی قید کے زمانے میں یہودیوں نے بھی یروشلم کے محاصرہ اور تباہی کے غم میں چار دن کے روزے رکھنا شروع کردئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت علیؓ اور اُن کے فرزندوں کے ماتم میں روزے رکھتی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اظہار غم کے لئے (ہندوؤں کی طرح) عرب عورتوں میں بھی سر منڈانے کی رسم جاری تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی وفات پر بیسیوں عورتوں نے اپنے بال منڈا کر اُن کی قبر پہ چڑھادئے تھے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بعد وفات نبوی اپنے بال منڈوا رکھے تھے۔

نصرانی بھی حضرت مسیح کے چالیس گھنٹے قبر میں رہنے کی یاد میں چالیس گھنٹے کا روزہ ایسٹر میں رکھتے ہیں۔ بعد میں یہ روزہ چالیس دن کا کردیا گیا۔

روزوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کسی مذہبی رسم (جیسے بپتسمہ) یا قربانی کرنے سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ رسم ہے کہ عید قرباں کے دن حضرت ابراہیمؑ کے قربانی کے روزے کی یاد میں قربانی کرنے کے وقت تک روزہ رکھتے ہیں۔

روزہ عموماً نفس کشی کے لئے رکھا جاتا ہے اسی لئے یونان کے کلبی و رواقی فلسفی بھی اس کی ہدایت کرتے تھے۔ یہودی ہر ہفتہ میں دوشنبہ اور جمعرات کو، اور نصرانی چارشنبہ اور جمعہ کو روزے رکھتے ہیں۔ اور ہندوؤں میں ہلال اور بدر کے دنوں میں روزے رکھتے ہیں۔ (مسلمان بھی ایام بیض کے روزے رکھتے ہیں)

عام خیال ہے کہ روزے کے ذریعے جو جسمانی کمزوری پیدا کی جاتی ہے اُس سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ اور روحانی طاقت حاصل کرکے انسان وبا، سحر، قحط، مفلسی اور موت کو دور کرسکتا ہے۔ ہندو سنیاسیوں میں یہ تصور عام ہے اور وہ عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کوئی کانٹوں پر سوتا ہے کوئی ننگا رہتا ہے، کوئی ہاتھ کو کھڑا کرکے سُکھا دیتا ہے۔ کوئی عمر بھر چُپ رہتا ہے۔ اور بعضے تو اپنی زبان کاٹ کر دیوی پر چڑھا دیتے ہیں۔ لیکن گوتم بدھ نے سالہا سال تک ان طریقوں پر عمل کیا اور جب کچھ نتیجہ نہ نکلا تو ان پر یہ روشن ہوا کہ جسم کو اذیت دینا بے کار ہے۔ اصل طریق عمل اعتدال کا رستہ ہے۔ نہ زیادہ کھاؤ کہ ہیضہ ہوجائے اور نہ کم کھاؤ کہ جسم ہی معطل ہوجائے اسی لئے زردشتر نے بھی روزہ رکھ کر جسم کو کمزور کرنا ایک گناہِ عظیم قرار دیا۔ اور فرمایا کہ "اہرمن" سے لڑنا ہے تو خدا کی نعمتوں کو استعمال کرکے جسم کو مضبوط بناؤ۔ لہذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ جسمانی کمزوری بڑھانے سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ اسلام بھی اس قسم کے روزے کو منع کرتا ہے۔ اسی لئے روزوں کا زمانہ سردیوں یعنی دسمبر کے لئے مخصوص ہے۔

حضرت مسیحؑ خود روزے رکھتے تھے (لوقا ۴/۲) اور اُنھوں نے روزوں کا حکم بھی دیا تھا۔ پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ روزہ نمائش کے لئے رکھنا درست نہیں۔ (متی ۱۶/۶) نصرانی بھی اُن کے چالیس دن رات کے روزوں کی یاد میں عید میلاد مسیحؑ کے موقع پر اسی لئے روزے رکھتے ہیں کہ شیطان کے بہکانے میں

نہ آئیں، اور حضرت مسیحؑ کی طرح یہ کہہ سکیں کہ "انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔ زندگی کے لئے کلمات اللہ کی مدد کی ضرورت ہے۔" (متی ۴)

صوم عاشورا سنہ ۱ھ: جب ہجرت مدینہ کے بعد رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہودی "یوم توبہ" کو صوم عاشورہ کہتے ہیں۔ یہ مہینہ اعتدال خریفی کے قریب ستمبر اکتوبر میں ہوا کرتا ہے۔ یہی مہینہ یعنی "تشرین" فلسطینی یہودیوں کا پہلا مہینہ ہوتا تھا۔ اسی مہینہ کو اہل حبشہ مسکرم کہتے ہیں۔ اور نیا سال اس کی پہلی تاریخ سے شروع کرتے ہیں۔ عربوں میں چونکہ نسی کی رسم جاری تھی اور وہ تین سال بعد ایک لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری سال کو شمسی بنا لیا کرتے تھے اس لئے یہودی تشرین اور عربی رجب ایک ہی ساتھ شروع ہوتے تھے سنہ ۱ھ میں جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورۂ تشرین (رجب) کو یوم توبہ مناتے ہیں تو آپ نے بھی اس دن روزہ رکھا مقصد یہ تھا کہ یہودی محسوس کریں کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔

ترتیب قرآن اور صوم رمضان سنہ ۲ھ: لیکن جب آنحضرتؐ نے دیکھا کہ باوجود معاہدہ ہونے کے ابن جحشؓ کے قتال کی وجہ سے یہود مخالفت پر آمادہ ہیں تو نہ صرف آپ نے بیت المقدس کے قبلہ کو ترک کر کے قبلۂ اول (کعبہ) کی طرف قبلہ بنا دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ صوم عاشورا فرض نہیں ہے بلکہ صوم شہر رمضان کو فرض کر دیا۔

حکمت و پس منظر رمضان سنہ ۲ھ: قرآن کے ہر حکم (کتاب) میں ایک مقصد (حکمت) مضمر ہے۔ اس لئے حکمت صوم کے لئے اگر آپ صوم رمضان سنہ ۲ھ کے زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس زمانے میں مسلمان مہاجرین کو ہر قسم کے سامان کی ضرورت تھی، خوراک، لباس، اسلحہ، بار برداری کے اونٹ سواری گھوڑے اتنے بھی نہیں تھے کہ تین سو تیرہ بدریوں کو کفایت کر سکتے۔ یہی زمانہ تھا جب انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا تھا اور یہی زمانہ تھا جب لوگوں کو روزہ رکھ کر خوراک بچانے اور اپنے مسکین ساتھیوں کا پیٹ بھرنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں آجکل کی سی بے عملی کی حالت نہ تھی کہ ایک مسلمان کھاتا اور دوسرا بھوکا مرتا۔ یا ایک فدیہ دیکر روزہ سے بچ جاتا اور دوسرا باوجود ضعف جسمانی کے روزہ رکھنے پر مجبور ہوتا۔

رمضان جاڑوں میں ہونا چاہئیے، یہی سُنّتِ رسولؐ ہے!

شعبان ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ اس سے پہلے یہودیوں سے آنحضرتؐ دفاعی معاہدہ کر چکے تھے، اور ان سے دوستی کی بہت کوشش کی تھی حتیٰ کہ عاشورے کا روزہ بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن حضرمی کے قتل کے بعد یہودی اتنے خوش ہوئے اور مسلمانوں پر آوازے کسنے لگے کہ خدا نے تحویل قبلہ کا حکم دیا اور یروشلم سے جو یہودی قبلہ تھا، منہ پھیر کر ابراہیمی قبلہ یعنی کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز کا حکم ہوا۔ اس پر منافق یہودی مسجد نبویؐ سے نکل گئے اور کہنے لگے کہ آیات اللہ (احکام الٰہی) میں تبدل و تنسیخ ہو رہی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آیت (حکم) تحویل قبلہ نہ تبدیل حکم الٰہی ہے نہ تنسیخ، بلکہ جو بدعت یہودیوں نے یروشلم کو قبلہ بنا کر شروع کر دی ہے اس کی جگہ پہلے بیت اللہ یعنی کعبہ کو قبلہ بنانے کا بہتر حکم (آیت) ہے۔ اسی طرح اونٹ کو حلال سمجھنے کا بھی حکم ہے۔ یہ حکم تالمود کی خود ساختہ آیت کو منسوخ کر کے اصلی دین ابراہیمی کا رستہ بتاتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کی حقیقت:-

غرضکہ اُس زمانے میں جبکہ یہودیوں پر قرآنی انداز شروع ہو گیا تھا، آنحضرتؐ نے یہ خدائی حکم سنایا کہ ہمیں وہ روزے رکھنا چاہئیں جو ہم سے پہلے کے اہل کتاب (یعنی نصاریٰ) رکھتے تھے۔ یہ روزے متعدد تھے۔ چالیس دن کے روزے ۱۵۔ نومبر سے ۲۵۔ دسمبر تک ولادت مسیحؑ کی خوشی میں رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح چالیس دن کے روزے وفات مسیح کے سلسلے میں ایسٹر (EASTER)۔ کے زمانے میں رکھے جاتے تھے۔ چونکہ قرآن کے نزدیک وفات مسیحؑ سے زیادہ اہم ولادتِ مسیحؑ تھی اور اسی کے اختتام پر مسیحی دنیا میں جشن ولادتِ مسیح منایا جاتا تھا

اس لئے آنحضرتؐ نے ۲ھ سے ۸ھ تک رمضان کے روزے ۱۵۔ نومبر سے ۲۵۔ دسمبر تک کے زمانے میں رکھے۔ یاد رہے کہ اہل عرب بھی شمسی تقویم کے پابند تھے اور ہر تیسرے سال لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری سال کو شمسی بنا لیتے تھے اس لئے رمضان کا مہینہ ہمیشہ جاڑوں میں ہوا کرتا تھا۔ اور غار حرا پر جب آنحضرتؐ تحنث یا تحنف فرمایا کرتے تھے تو اُس وقت بھی ۱۷۔ رمضان کو قرآن کا نزول جاڑوں ہی کے موسم میں ہوا تھا۔ اب آپ پر "کتب علی الذین من قبلکم" کی حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جس طرح نصاریٰ رمضان کے روزے (۱۵۔ نومبر سے ۲۵۔ دسمبر کے اندر کے مہینہ میں) رکھتے ہیں اُسی طرح مسلمانوں کو بھی روزے رکھنا چاہئیں۔ تاکہ یہود کے نزدیک جو نصرانی کافر تھے ان کو مسلمان دوست بنالیں اور دوسرے ملکوں کے نصرانی بھی شاہ حبشہ کی طرح مسلمانوں سے برادرانہ سلوک کریں۔ چونکہ اس زمانے میں دن بہت چھوٹے اور ٹھنڈے ہوتے ہیں اسی لئے بدر کے سفر جہاد میں آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھے۔ جس کا جی نہ چاہے وہ سفر اور مرض کی رعایت سے فائدہ اُٹھالے۔ لیکن یہ یاد رکھے کہ روزہ بہرحال ادا کرنا پڑے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے (یطیقونہ) وہ فدیہ یعنی صدقہ دیا کریں جو کم از کم ایک مسکین کے کھانے کی برابر ہو۔ غرضکہ (فدیہ دے کر) تطوع خیر کرنا ایک فرد کے لئے (خیر لہٗ) بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سب (اجتماعی طور پر) روزہ رکھو، تو اس میں تم سب کا بھلا (خیر لکم) ہے۔ کافی خوراک بچے گی اور کوئی بھوکا نہ رہے گا۔ اور غزوات کی تیاری میں مدد ملے گی۔

فدیہ صوم:۔ وعلی الذین یطیقونہٗ فدیۃ طعام مسکین (اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے (یعنی بوجہ ضعف جسمانی روزہ

ان کی طاقت سے باہر ہے) وہ ایک مسکین کا کھانا ضرور دیں۔ اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ مقصد صوم خوراک کو بچانا تھا۔ روزہ رکھو گے تب بھی خوراک بچے گی اور نہ رکھو گے تب بھی بچے گی۔ اگر روزہ رکھو گے تو جو خوراک بچے گی وہ خود تم پر صرف ہو گی اور اگر روزہ نہ رکھو گے تو ہر روزے کے بدلے میں بھی وہی کرنا ہو گا کہ خوراک بچاؤ گے اور اپنے ایک مسکین بھائی کو کھلاؤ گے۔ گویا روزہ رکھنا خود ایک قسم کا صدقہ بھی تھا، فدیہ بھی تھا اور انفاق بھی تھا۔

فدیہ، صدقہ، انفاق: یاد رہے کہ ابھی دولت کتابیہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں سے "حزب اللہ" کے مقاصد کے لئے انفاق کی تاکید ہی کی جا سکتی تھی۔ اسی لئے سورہ بقرہ میں "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" سے مراد خوش دلی سے چندہ جہاد دینے کے ہیں۔ دیکھئے سورۂ بقرہ (۱۹۶) میں صوم کو صدقہ کے برابر بتایا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ط

اگر حج کے بعد کوئی سر نہ منڈ اسکے مرض یا سر کی بیماری کی وجہ سے تو وہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا لذائذ سے پرہیز کرے۔

اسی طرح انفاق بھی جہاد مالی (صدقہ) کا درجہ رکھتا ہے اور جہادِ جانی کے برابر ہے:-

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ، اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (سورۂ توبہ ۹۰)

کمزور، مریض اور وہ لوگ جو مسکنت کی وجہ سے انفاق کرنے سے معذور ہیں (اور جہاد میں جان یا مال سے کسی طرح شریک نہیں ہو سکتے) تو ان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ خدا اور رسول کی محبت ہی دل میں رکھیں۔

بہرحال روزہ ہو، فدیہ ہو، صدقہ ہو یا انفاق ہو سب کا مطلب اللہ اور رسولؐ کی محبت میں جان مال اور اپنے خیالات کو لگا دینا ہے۔ اور ان سب کا مقصد دنیا م دولت کتابیہ ہے۔ تاکہ دنیا خوف اور جوع سے بچ کر ترقی کر سکے۔

// **صوم اور نسک**: نسک جمع ہے نسیکہ کی۔ اس کی ایک جمع نسائک بھی ہے۔ نسیکہ قربانی کو کہتے ہیں۔ قربانی کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلایا جائے۔ جیسا کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ میں نحر کے معنی صدقہ کے ہیں۔ اگر نُسک کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ قربانی یعنی صدقہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ گویا اس آیت میں دو ہم معنی لفظ استعمال ہوئے۔ لیکن اگر اس مریض مؤمن کا لحاظ رکھا جائے جو نہ روزے رکھ سکتا ہے، نہ صدقہ دے سکتا ہے، نہ قربانی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو اس کے نسک سے مراد اس لفظ کے دوسرے معنی ہوں گے یعنی پارسا شدن یا پرہیزگاری و زہد و عبادت کردن۔ یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ اقوام عالم میں سنیاس اور زہد و تنسک کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان میں تقلیل غذا اور لذائذ سے پرہیز اور عبادات کی کثرت کے ساتھ ساتھ زاہدانہ، عابدانہ در راہبانہ زندگی اختیار کی جاتی ہے حتےٰ کہ جین مذہب والے فاقہ کر کے مرجانا روا رکھتے ہیں۔ نصاریٰ میں روزہ کی ایک قسم نُسک بھی ہے۔ یعنی کسی ایک قسم کے گوشت کو نہیں کھاتے اور اسے روزہ کہتے ہیں ہم نے نسک کے معنی لذائذ سے پرہیز" لکھے ہیں۔

اسلامی تقویم کو شمسی ہونا چاہیئے

انما عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً اللہ کے قانون کے مطابق شمسی سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے۔

جس طرح اہل کتاب کی پیروی میں رمضان کو ۱۰ نومبر سے ۲۵ دسمبر تک کے زمانے میں ہونا چاہیئے، اسی طرح حج بھی اس طرح ہونا چاہیئے کہ اہل کتاب اس زمانے میں حج یا مذہبی میلہ کرتے ہوں۔ یہ یاد رہے کہ جب رمضان دسمبر میں ہوگا تو ذی الحجہ کا مارچ میں ہونا ناگزیر ہے۔ (کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم)

دنیا کے ہر ملک میں اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کے موقع پر، جبکہ دن رات برابر ہوجاتے ہیں، موسمی میلے ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں۔ ان میلوں میں نہ صرف تجارتی مال لوگوں تک پہنچتا تھا، بلکہ لوگوں کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا بھی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ تیر اندازی۔ گھوڑ دوڑ کشتی شعر و سخن خطابت، موسیقی، مے نوشی و عیش پرستی کے ساتھ ساتھ پرستش و عبادت بھی ہوا کرتی تھی اور لوگ امن و امان سے سفر بھی کرسکتے تھے۔ جنگ اور قصاص کے دیوتا اپنے غصے کو کم کردیتے تھے۔ اور ربیع و خریف کی بہار کے زمانے میں ہر جگہ نوروز کی خوشی میں عید منائی جاتی تھی۔

عرب میں ربیع کے میلے کو حج اکبر اور خریف کے میلے کو حج اصغر کہتے تھے اسی لئے ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینوں میں حج اکبر (بڑے میلے) کے زمانے میں قتل و غارت گری حرام تھی۔ اور حج اصغر یعنی چھوٹے میلے میں جو رجب میں ہوا کرتا تھا، صرف ایک مہینہ امن عام کا اعلان ہوتا تھا۔

حج کے میلوں کی حکمت و غایت: جس طرح صلوٰۃ کی حکمت خوف و جوع کے دور کرنے کیلئے دولت کتابیہ

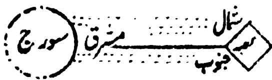
کی تیاری ہے۔ اُسی طرح حج ایک قومی کانفرنس ہے جس میں "منافع للناس" سے مراد سیاسی، تمدنی اور تجارتی منافع ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قبائل کے میل جول اور جسمانی و ذہنی مقابلوں اور تفریحوں کا بھی موقع پیدا ہو جاتا ہے۔ حج اکبر سے پہلے اور اس کے بعد ذوالمجنّہ، ذوالمجاز اور عکاظ میں میلوں کا ایک سلسلہ قائم تھا اور کل عرب کے قبائل دوسرے ملکوں کے تاجروں سے مل کر مادّی مصنوعات اور ذہنی تخلیقوں کا تبادلہ کیا کرتے تھے اسی زمانے میں مفاخرت و منافرت بھی ہوتی تھی۔ اسلام نے اس تفاخر بالآباء کو ختم کر دیا، ذکر اللہ اور تجارت کا حکم دیا۔ اور بتایا کہ مشرکوں کو روک دینے سے یہ نہ ڈرو کہ تم مفلس ہو جاؤ گے۔ اللہ اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا۔ (وان خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللّٰہ) (التوبہ)

موسمی حجوں کے لئے قرآنی اشارے: قرآن حکیم میں موسمی حجوں کے متعلق بہت سے اشارے ہیں، جن سے صاف ثابت ہے کہ حج کے لئے بھی روزوں کی طرح مخصوص موسم ہے :-

(۱) سورۃ القریش سے ثابت ہے کہ ذی الحجہ کے حج اکبر اور رجب کے حج اصغر کے زمانے، گرمی اور سردی کے موسموں میں ہوا کرتے تھے۔ حجوں کے بعد یہ رحلتیں ہوتی تھیں۔ (حج اکبر میں دھوپ بڑھتی تھی اسی لئے یہ ایام تشریق تھے)

(۲) سورہ رحمان سے ثابت ہے کہ سورج کے دو مشرق اور دو مغرب (مشرقین و مغربین) ہیں۔ خدا کے حکم سے کعبۃ اللہ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس طرح بنایا ہے کہ اُس کا ایک کونا مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف ہے۔ اور جب موسم اعتدال پہ آتا ہے تو سورج کی شعاعیں براہ راست حجر اسود پہ پڑتی ہیں۔ گرمیوں میں سورج شمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شمالی دیوار کعبہ کو روشن کرتا ہے، سردیوں میں یمین (جنوب) کی طرف مائل ہوتا ہے اور رکن یمانی کو روشن کرتا ہے۔ اس طرح چھ مہینے جنوب مشرق سے اور چھ مہینے شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ گویا اُس کے مشرقین (دو مشرق) اور مغربین ہوتے ہیں۔ قریش اس سے واقف تھے اور اسی لئے

انکا قلمس (ناسیٔ الشہور) حج کے بعد مقام منیٰ پر اعلان کیا کرتا تھا کہ آئندہ سال حج اکبر محرم میں ہوگا۔ معہذا کسی مشرک نے حسب عادت "رب المشرقین والمغربین" پر استہزا نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ سال میں اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کے اعتبار سے جاڑے کا مشرق الگ اور گرمیوں کا مشرق الگ ہوتا ہے۔ گویا مشرقین و مغربین کی حقیقت اُن پر روشن تھی۔



اس کے علاوہ جنتری بنانے والے ناسیٔ الشہور حضرت اسماعیلؑ کے زمانے سے برابر چلے آتے تھے۔ عدنان اول، قیدار بن اسماعیلؑ کی اٹھیسویں پشت میں تھا اس کے زمانے میں نسیٔ کا عہدہ قائم تھا۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے تک باقی رہا۔

(۳) حضرت ابراہیم عُرفہ (خالدیہ) کے باشندے تھے۔ وہاں کواکب پرستی، صومیت سے شمس (بعل) پرستی رائج تھی۔ اُن کے معبد رصدگاہوں کا کام دیتے تھے جن سے مشارق و مغارب نجوم بھی معلوم کئے جاتے تھے۔ بابل میں ان کے کھنڈر موجود ہیں۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کواکب پرستی سے منحرف ہو کر رب المشارق والمغارب کے بندے بن گئے تھے اس لئے اُنہوں نے جو بیت اللہ بنایا، اُس میں صنعت تو رصدگاہ کی رکھی، لیکن طواف کا رُخ بدل دیا۔ شمس پرست آج سورج کی گردش کی سمت یعنی جنوب سے شمال کی طرف اپنے بتوں کا طواف کرتے ہیں۔ لیکن سنّتِ ابراہیمی یہ ہے کہ شمال سے جنوب (بائیں سے دائیں) طواف ہوتا کہ ثابت ہو کہ ہم شمس پرست نہیں، خدا پرست ہیں۔ اسی لئے اگرچہ یمین (دایاں۔ دکھن) اور شمال (بایاں۔ بام) کا قدیم سامی تصور سورج کے اعتبار سے سامی و ایرین زبانوں میں اب تک قائم ہے اور اصحاب الیمین (دکھن اچاری = راست رو) اور اصحاب الشمال (بام مارگی = چپ رو) کے محاورے بھی باقی ہیں، لیکن ہند میں طواف (پرکرما) کا طریقہ اُلٹا ہے۔ جو قدیم شمس پرستی کی یادگار ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ کعبہ کی

تعمیر یقیناً ابراہیمی ہے اور اس کی جنوبی و شمالی دیواریں رصدگاہی اصول پر
بنی ہیں۔

مختلف ملکوں کے نوروز اور میلے:

بابل اور ایران میں نوروز ۲۱۔ مارچ کے قریب ہندستانی
ہولی کی طرح سورج کی آمد آمد کا تہوار تھا۔ اسی طرح جاڑوں کی ابتدا میں
۲۱ ستمبر کے قریب ایران میں نیم سردہ اور ہند میں دسہرہ (دیوالی) اب تک جاری ہے
ان ہی موسموں کو اہل عرب موسم حج (ذی الحجہ) اور رجب (بیچ کا مہینہ) قرار دے کر
میلے تہوار (حج اور عید) منایا کرتے تھے۔ اور ان ہی مہینوں میں یہودی عیدیں
ہوتی تھیں۔ ان کا نوروز فلسطینی ۲۱۔ستمبر کے قریب ہوتا ہے، اسی مہینہ تشرین
کی ۱۰۔ تاریخ کو یہودی "یوم تربہ" یا عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ جسے آنحضرتؐ
نے بھی سنہ ۱ھ میں رکھا تھا۔ ۲۱۔ستمبر ہی سے حبشہ والوں کا نوروز میسکرم کے
مہینے سے شروع ہوتا تھا، اور اب بھی ہوتا ہے۔ یہودیوں کا بابلی نوروز نیسان کے
مہینے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ۲۱۔ مارچ کے قریب ہوتا ہے اور اعتدال ربیعی
سے شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں حضرت مسیحؑ فلسطین آئے تھے۔ اور
بقول نصرانیاں انھیں سولی دی گئی تھی، اور وہ تین دن کے بعد جی اٹھے
تھے۔ لہٰذا وہ بھی یہودیوں کی طرح عید فصح EASTER (ایسٹر) مناتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی غلامی کے زمانے میں جو بھیڑ کا بچہ یہودیوں نے ذبح
کیا تھا وہ درحقیقت "مسیح بن اللہ" تھا۔ اس کے خون کے نشانات کو دیکھ کر
خدا کا فرشتہ اُن کے گھروں کو چھوڑ کر گزر (Pass-over) گیا تھا
اور مصریوں کے پلوٹھی کے بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ غرضکہ اسی موسم میں یہودی
ونصرانی دونوں عید فصح مناتے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ چاند کی
۱۴۔ تاریخ کو جو ۲۱۔ مارچ کے بعد آئے اس میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔
عجیب اس لئے ہے کہ ہند میں دسہرہ اور عرب میں ایام تشریق اسی زمانے

میں ہوتے ہیں۔ اور ہر جگہ قربانی کی رسم بھی انجام دی جاتی ہے۔ البتہ عرب میں سنہ ۱۲ھ سے قمری تقویم جاری ہوئی۔ اس کی وجہ سے حج کے مہینے بدلتے رہتے ہیں اور حج اعتدال کے موسموں میں نہیں ہوتے۔

آیت نسی: قرآن میں آیت نسی (انما عدۃ شھور عند اللہ اثنا عشر شھرا) سے ثابت ہے کہ موسمی سال کے بارہ مہینے ہونا چاہئیں۔

عرب جاہلیہ، اہل ہند کی طرح تیسرے سال ایک لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری مہینوں کے سال کو شمسی سال کے برابر کر لیا کرتے تھے۔ قرآن نے حکم دیا کہ یہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں، وہی بارہ مہینے رکھے جائیں۔ یہاں یہ یاد رکھئے کہ سال (یعنی حول سنہ یا عام) کو ہمیشہ موسمی سال مانا جاتا ہے۔ جب کہ ایک موسم گردش کر کے پھر اُسی نقطہ پہ آجائے۔ یعنی سنہ یا حول کا تعلق سورج کی گردش سے ہے اور سال کے بارہ مہینے صرف اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ یا تو رومی تقویم کو مانا جائے یا ایرانی تقویم کی مانند کوئی طریقہ ایجاد کیا جائے۔ جولین کلنڈر اب بدل کر گریگورین ہو گیا ہے لہذا موسموں کا تعین اس کے حساب سے کر کے اس زمانے میں جب کہ یہودی و نصرانی و ایرانی و ہندی عید نوروز یا عید فصح مناتے ہیں اُسی زمانے میں عید حج اکبر بھی رکھی جائے۔ یہ کام بہت آسان ہے۔

مسلمانوں نے اپنی فصلی جنتری چند سال کے تجربے کے بعد ہی بدل دی تھی کاش اہل علم جمع ہو کر بالاتفاق (بالاجماع) یہ فیصلہ کر دیں کہ حج اکبر اعتدال ربیعی میں، حج اصغر (رجب) اعتدال خریفی میں، اور رمضان نومبر دسمبر میں ہوا کرے گا۔ تو کتابیوں سے تعلقات بھی بڑھ جائیں۔ منشائے خداوندی بھی پورا ہو جائے اور سنت رسولؐ بھی ادا ہوتی رہے۔ یہی نہیں بلکہ موسموں کی سختی کے زمانے میں جو ہزاروں جانیں روزہ اور حج کی وجہ سے جاتی ہیں وہ بھی بچ جائیں اور منشائے حج یعنی منافع للناس، تجارت اور سالانہ اسلامی کانفرنس بھی

بڑی دھوم دھام سے ہو۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس تبدیلی کے بعد جو لوگ اللہ والے ہیں (خواہ وہ کسی ملک وملت سے تعلق رکھتے ہوں) وہ سب رفتہ رفتہ قبلہ ابراہیمی کو اپنا قبلہ مان کر اسلامی عید میں شریک ہوں گے، اور اسلام کے پیغام امن پر عمل کر کے صرف چار مہینوں کو نہیں بلکہ سال کے بارہ مہینوں کو حرام تسلیم کر لیں گے۔

یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ آنحضرتؐ نے جو حج کیا تھا اس میں فرمایا تھا کہ زمانہ گردش کر کے پھر اسی نقطہ پر آگیا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلا حج کیا تھا۔ عام الوداع سنہ ۱۰ھ کا ماہ ذی الحجہ ۲۸۔ فروری سنہ ۶۳۲ء سے شروع ہوا تھا۔ یعنی ۹۔ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ۔ ۹۔ مارچ سنہ ۶۳۲ء کا دن اعتدال ربیعی سے گیارہ دن پہلے تھا۔ اس سال سے لوند کا مہینہ بڑھانے کی رسم تو ختم کر دی گئی، لیکن حول یا عام کو بارہ شمسی مہینوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ بہرحال اب بھی اسلامی تقویم کی بالاجماع درستی ہو سکتی ہے جس سے دنیا کو نفع پہنچ سکتا ہے اور ہزاروں حاجی سردی یا گرمی کی شدت سے بچ کر عالمی کانفرنس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اس کی تبلیغ ہر مسلمان پر فرض ہے، وہ یہ ہے :۔

"(ایھا الناس) انما النسیٓء زیادۃ فی الکفر، یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ (و یحرموا ما احل اللہ) و ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق

لوگو نسئی (لوند کا مہینہ ہٹا دینا) کفر کے زمانے کی بڑھائی ہوئی بات ہے، کافر اس سے گمراہ ہوتے ہیں۔ [illegible] مہینے کو کسی سال قتال کے لئے [illegible] کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام کر دیتے ہیں۔ اس طرح حرام (ادب کے) مہینوں کی گنتی تو پوری کر دیتے ہیں لیکن نتیجہ

اللہ السماوات والارض)
إنّ عدة الشهور عند الله
اثنا عشر شهرا في كتاب الله
يوم خلق السماوات والارض
منها اربعة حرم ثلاثة
متوالية ورجب مضر الذي
بين جمادى وشعبان) فاذا
انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا
المشركين) (التوبہ)

یہ ہوتا ہے کہ جو مہینہ اللہ نے حرام کیا
ہے وہ حلال بنا لیتے ہیں (اور جس مہینہ
حرام قرار دیتے
ہیں۔ بہرحال آج کا دن وہ دن
جبکہ زمانہ اور موسم گردش کرکے اسی
نقطہ پر آگیا ہے جس پر خلق کائنات
کے وقت تھا) اللہ کے نزدیک سال
کے بارہ مہینے ہیں۔ یہی اللہ کا قانون
ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرام (ادب کے)
ہیں (جن میں مشرکوں سے بھی قتال نہیں کرسکتے) تین مہینے توپے درپے ہیں
(ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم) اور چوتھا مہینہ رجب کا ہے جو جمادی اور شعبان
کے درمیان ہوتا ہے۔ ان چار مہینوں کے علاوہ مشرکین سے قتال جائز ہے۔

حرفِ آخر :

دنیا میں لادینیت بڑھ رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو دین سے ناواقف ہیں، یا اس کے متعلق غلط نظریات بنا چکے ہیں۔ اس لادینیت اور الحاد کی تمام تر ذمہ داری ان کے ذہنوں پر ہے جو دین کی حقیقت کو نہ سمجھنے کے باوجود اس کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ سائنس اور دین یعنی عقل و الہام میں تضاد ہے۔

ہر دین میں برہمنوں یا پوپوں کی جماعتیں موجود ہیں۔ اور وہی اپنے اپنے دینوں کو جس رنگ سے پیش کرنا چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور سب کو مجبوراً ان کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس اسلام نے کلیسائیت اور برہمنیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، خود اُسی اسلام میں اتنی ملل و نحل پیدا ہو گئی ہیں، اور اتنی تحزب و فرقہ بندی بڑھ گئی ہے کہ بات بات میں اپنوں ہی کی تکفیر ہوتی ہے۔ گویا وہ مسلمان جو کل دنیا کو مومن و شاکر بنانے آیا تھا، خود کتابیوں اور مومنوں کو امی اور خاسر بنا رہا ہے۔ اب نوبت یہ آ گئی ہے کہ علمائے سوء کی خود ساختہ روایات کے خلاف اگر کتاب اللہ بھی پیش کی جائے تو ان کے نزدیک وہ قابل قبول نہیں، اور پیش کرنے والا ان کے عقیدے میں کافر ہے۔

اگر کوئی قرآن سے یہ ثابت کرے کہ اس کی بیسیوں آیتیں تو کیا، ایک بھی منسوخ نہیں تو وہ کافر۔ اگر کوئی سینکڑوں آیتوں کو متشابہ المراد نہ تسلیم کرے تو وہ منکر۔ اگر وہ حروف مقطعات، سورۂ تحریم، سکینہ و جنود اللہ، اور بیسیوں آیتوں کو قرآن ہی سے غیر مبہم ثابت کرے تو وہ جاہل۔ اگر وہ قرآن کی یہ آیت پڑھے کہ (لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ۝ سورۃ النور ع ۲)

... کے رسول کریمؐ کو حضرت عائشہ صدیقہ پر قطعی کسی قسم کا شک شبہ نہ تھا، بلکہ انھیں تو یہ توقع تھی کہ مومنین و مومنات سنتے ہی کہہ دیں گے کہ یہ صریح تہمت (افک مبین) ہے۔ پھر باوجود اس نص صریح کے اگر وہ آن روایات کا انکار کرے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ شبہ میں تھے تو وہ منکر حدیث اور مدلس قرآن۔ غرضکہ اگر کوئی قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھے کہ (یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا) اور تاریخی ترتیب قرآن کے ذریعے اس کے حقیقی و بنیادی خط و خال نمایاں کرے تو وہ ناحق کوش اور وہ جو نصوص صریحہ کے خلاف اسراء کو معراج، متشابہ کو مشتبہ، آیات اللہ کو معجزات رسول بتائے وہ حق پرست۔ اس ظلم کے خلاف سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:

گیرم کہ رسم عشق من آوردہ ام بدہر
ظلم آفریدہ دل ناحق شناس کیست؟ (غالب)

بہرحال یہ نوجوان جو حقیقت اسلام تک پہنچنے کا تھوڑا سا وقت نکال سکتے ہیں انھیں "مختصر سیرت سیدنا محمد صلعم" پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کے غیر تاریخی مطالعہ نے اسلام پر کیسے کیسے حجابات ڈال دئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اخلاقیات و سیاسیات کا رشتہ کن کن مدارج سے گزر کر استوار ہوتا ہے، اور وہ یہ بھی معلوم کر لیں گے کہ جمہوریت افراد قوم کی کثرت رائے کی حکومت کو نہیں کہتے بلکہ یہ اصول کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہے۔ اسی کو قرآن نے کتابی آمریت (اصول کی ڈکٹیٹر شپ) کہا ہے اور اسلام، طاعت الٰہی یا صراط مستقیم ہے، جو دین و دنیا، سائنس اور وحی، منطق اور محسوسات یعنی عقل و دل کے تضاد کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے سامنے دین کا یہ روشن پہلو نمایاں ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ لا الٰہ کی نفی میں لادینیت کے توہمات کا انکار اور اِلَّا اللہ کے اثبات میں دین کے حقائق کے اقرار کو پا جائیں گے۔

حاصل کلام



مسلمانوں کے انتشار فکر و عمل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن حکیم اور عمل رسول کریمؐ متضاد تصورات کی وجہ سے ناقابل فہم بن گئے ہیں۔ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔
اس انتشار کو دور کر کے صحیح فکر و عمل پیدا کرنے کے لئے ہر ملک میں ایسے مفکرین کی ضرورت ہے جو قرآن و سیرت کا تاریخی ترتیب کے ساتھ مطالعہ کریں اور حقیقت اسلام کو اپنی قومی زبانوں میں عامۃ الناس کے سامنے لائیں۔

اس سلسلے میں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی

(۱) ہر ملک کے علماء ایک بیت الحکمہ قائم کریں، اور تاریخ عالم کے نقشے میں افکار انسانی کی صحیح جگہ کو دیکھیں۔ پھر اپنے قومی موقف کو خواہ وہ ذہنی ہو یا مادی، دوسری قوموں کے افکار و اعمال کے مقابلے میں جانچیں۔ اسے ہم "پس منظر اسلام" کہہ سکتے ہیں۔

(۲) قرآن کی مختلف سورتوں (اور جہاں ضرورت ہو رکوعوں) کو تاریخی ترتیب سے مرتب کریں اور ہر سورہ (یا رکوع) کے سامنے یہ نوٹ کر دیں کہ اس کے نزول کے وقت آنحضرتؐ کا روئے سخن کس قوم کی طرف تھا، اس کی پچھلی تاریخ کیا تھی، اور نزول کے وقت وہ کن کن تاریخی و معاشی احوال سے گزر رہے تھے۔

(۳) آخر میں مندرجہ بالا تاریخ اقوام اور ترتیب قرآن کی روشنی میں ایک سیرت نبوی مرتب کر لیں، جس کے ذریعے سے وہ ظاہر کریں کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے حضرت محمد عربیؐ کی رسالت تک اور آپؐ کے بعد متممین رسالتؐ کی خلافت تک فکر و عمل اسلام کی کیا نوعیت رہی۔ اسے کس طرح ترقی دی گئی۔ اور کس طرح یہ روشنی مختلف اقوام میں انقلاب برپا کرتی رہی، اور کرتی رہے گی۔

عربی فارسی جاننے والوں کو امام ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات سے کافی روشنی مل سکتی ہے۔



مطبوعات
بیت الحکمت
دہلی
(ہند)

سیرتِ قرآنیہ سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ولقد یسّرنا القرآن للذکر فہل من مدکر؟

بادشاہی اور جاگیرداری دور ختم ہو رہا تھا۔ جمہوری اور مشینی دور کی ابتدا تھی اس وقت امام ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کی انقلابی روح کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ارباب حکومت اور امراء کے لئے تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی حکمت، عقل، نقل اور کشف کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے تفسیر فتح الرحمان سے پہلے اسے اور المسوّی کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ متوسط طبقہ کے لئے شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹) نے تفسیر فتح الرحمان کے اصول کی تشریح کے لئے فتح العزیز لکھی اور جماعت مجاہدین تیار کی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو قرآن و حدیث کا درس دیا۔ انہوں نے قرآن کو امت مسلمہ کے عام لوگوں کی ہندی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ قرآنی دعوتِ انقلاب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی تھے۔

قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سیرت نبوی کے اس کے تاریخی ادوار متعین کر لئے جائیں اور تاریخ تمدن انسانی کے پس منظر میں اسے اپنی زبان میں سمجھا جائے۔ اردو میں اس قسم کی سیرت مکتبہ بیت الحکمت دہلی سے مل سکتی ہے۔ اسے بیت الحکمت ہند نے بیس زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس سیرت میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمونہ "جہان انقلاب" ہے۔ اس طرح سیرت کے قرآنی مطالعے سے متعدد غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور حکمت قرآنیہ فکر انسانی سے بہت قریب آ جاتی ہے۔ قیمت قسم اول چار روپے، قسم دوم تین روپے آٹھ آنے

سول ایجنٹ مکتبہ کتاب گھر اردو بازار دہلی